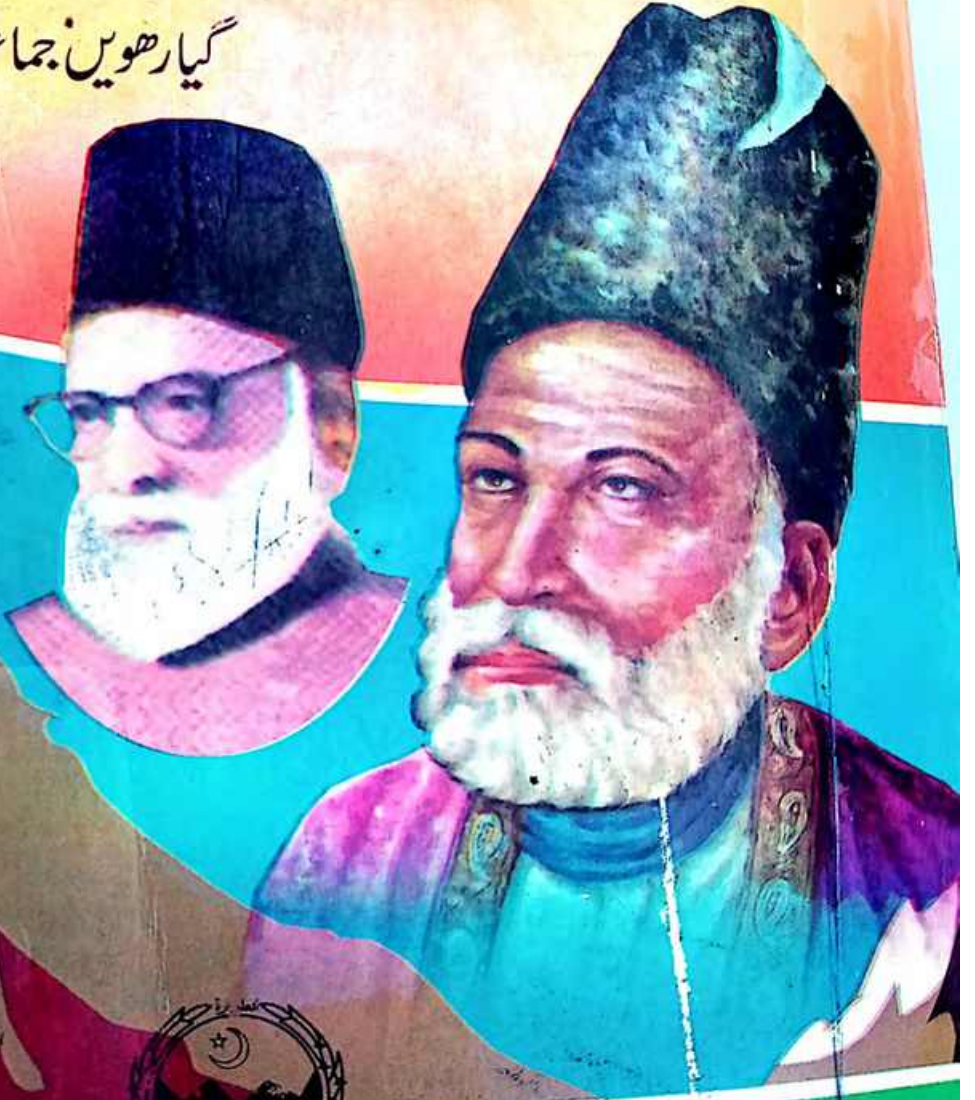




اردو (لازمی)

گیارہویں جماعت کے لیے

Free From Government
NOT FOR SALE



خیر پختونخوا ایگسٹ بک ہاؤس، پشاور

جملہ حقوق بحق خیبر پختونخوا ایکسٹ بک بورڈ پشاور محفوظ ہیں۔

تیار کردہ: خیبر پختونخوا ایکسٹ بک بورڈ، پشاور
منظور کردہ: وفاقی وزارت تعلیم (شعبہ نصاب)، حکومت پاکستان اسلام آباد
مراسلہ نمبر: F.1-12/2009-Urdu مؤرخہ 03-05-2010

مولفین: ☆ ڈاکٹر جاوید بادشاہ ☆ پروفیسر خالد صغیر ڈار
☆ پروفیسر محمد جمال ☆ ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار
☆ ڈاکٹر طارق ہاشمی

نظر ثانی و ترامیم: ☆ سید طاہرہ حسین، نظامت نصاب و تعلیم اساتذہ، ایبٹ آباد
☆ سائرہ بی بی، ایس ایس اردو، گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری سکول، ملک پورہ
☆ مشتاق احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج، خان پور (ہری پور)
☆ شاہین زمان، ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج سرائے صالح
☆ ابرار خان، لیکچرار اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، نوشہرہ۔
☆ ڈاکٹر محمد بلال، ایس ایس اردو، خیبر پختونخوا ایکسٹ بک بورڈ پشاور

نگران نظر ثانی کمیٹی: سید بشیر حسین شاہ، ڈائریکٹر، نظامت نصاب و تعلیم اساتذہ، ایبٹ آباد
مدیر: سلیم اللہ علوی، ماہر مضمون (اردو) خیبر پختونخوا ایکسٹ بک بورڈ، پشاور

طباعت زیر نگرانی: رشید خان پاشا، خیل (چیمبر لین)

سعید الرحمن، (ممبر ای اینڈ پی)

خیبر پختونخوا ایکسٹ بک بورڈ پشاور

2021-22

www.kptbb.gov.pk

membertbb@yahoo.com

091-9217159-60

تقریبی سال:

ویب سائٹ:

ای میل:

فون نمبر:

حاصلاتِ تعلیم

تدریس اردو کے ذریعے طلبہ اس قابل ہو سکیں گے کہ :

☆ اردو زبان شناسی پر مکمل عبور حاصل کر سکیں۔

☆ اصنافِ سخن کی تعریف کر سکیں اور انھیں پہچان کر سکیں۔

☆ مکمل علمِ بیان، علمِ بدیع اور صنعتوں کی تعریف کر سکیں۔

☆ زبان، احساسات، جذبات، خیالات اور تصورات کے حوالے سے کی گئی گفتگو کا مکمل ادراک کر سکیں۔

☆ اردو میں اپنا مافی الضمیر پورے سیاق و سباق کے ساتھ بول چال، گفتگو اور تقریر کے ذریعے سمجھا سکیں۔

☆ عملی زندگی میں سماجی ضرورتوں کے تحت اردو کو مہارت سے استعمال کر سکیں۔

☆ اردو نظم و نثر کی صورت میں موجود ادب پارے، صحافت، دفتری و عدالتی ضروریات، جدید علمی اور تکنیکی

تحریروں کو پڑھ کر ان کا پورا فہم حاصل کر سکیں۔ ان کا استحسان کر سکیں اور ان پر تنقیدی رائے دے سکیں۔

☆ روزمرہ زندگی کے مسائل کے حوالے سے غیر رسمی خطوط لکھ سکیں۔ داخلہ فارم، شناختی کارڈ فارم اور دیگر

فارم وغیرہ پُر کر سکیں۔

☆ کسی ادبی، علمی، صحافتی موضوع پر اپنے وسیع تر مطالعہ، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں استدلال، درست

تلفظ اور عمدہ لب و لہجے کے ساتھ کم از کم پانچ منٹ تک تقریر کر سکیں۔

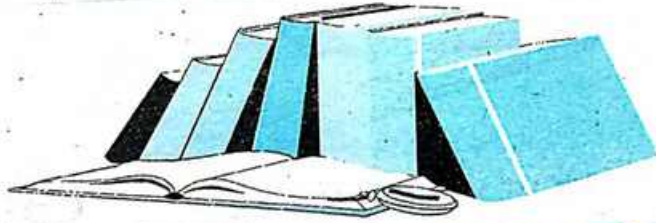
فہرست

حصہ نثر

صفحہ	عنوان	نمبر
1	مرسید احمد خان	1
11	مولوی ذکا اللہ	2
16	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	3
23	ڈاکٹر سید عبداللہ	4
30	ڈاکٹر عبادت بریلوی	5
37	مشتاق صدیقی	6
42	رتن ناتھ سرشار	7
54	خدیجہ مستور	8
63	آغا حشر کاشمیری	9
72	خواجه معین الدین	10
85	ابن انشا	11
95	جمیل الدین عالی	12
101	بشیر احمد بلوچ	13
105	(ن) مرزا غالب	14
108	(ب) علامہ اقبال	15

حصہ نظم

صفحہ	عنوان	نمبر
115	ماہر القادری	1
118	محسن کاکوری	2
121	نظیر اکبر آبادی	3
125	میر حسن	4
128	میر انیس	5
132	مرزا دبیر	6
135	الطاف حسین حالی	7
140	اکبر الہ آبادی	8
143	حقیقہ جالندھری	9
147	سید محمد جعفری	10
151	سید حمیر جعفری	11
154	مرزا محمود سرحدی	12
157	عبدالرحمن بابا / مترجم طہ خان	13



Not For Sale



سر سید احمد خان

وفات: ۱۸۹۸ء

پیدائش: ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء

سر سید احمد خان دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید محمد متقی کو بادشاہ کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق اُنھوں نے قرآن مجید، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ والد اور بڑے بھائی کے انتقال کے بعد اُن کی زندگی پر مذہبی رنگ نمایاں ہو گیا اور اُنھوں نے فقہ، حدیث اور قرآن مجید کا از سر نو مطالعہ شروع کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت وہ بجنور میں تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی تباہی نے اُن کے دل پر گہرا اثر کیا اور مسلمانوں کی اصلاح کا پروا اُٹھایا۔

اُنھوں نے اندازہ لگایا کہ کسی بھی قوم کی اصلاح اور ترقی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں اس لیے اُنھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کیں۔ علی گڑھ کالج اس کی روشن مثال ہے۔ اس کے علاوہ عام مسلمان گھرانوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے ایک رسالہ، ”تہذیب الاخلاق“ بھی جاری کیا۔

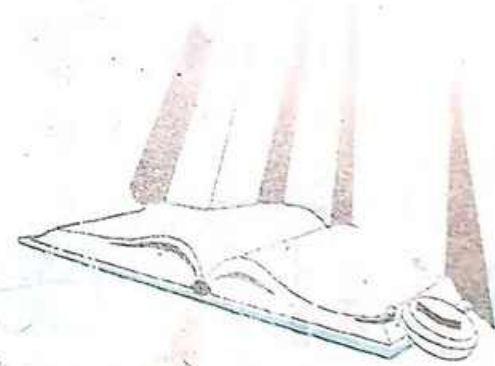
سر سید کا ایک اور بڑا کارنامہ سادہ اور آسان نثر کی ترویج تھا۔ اُنھوں نے اُس زمانے کی طرز نگارش، جو مقفی اور مسجع نثر کی صورت میں تھی، کو ترک کیا اور مقصدیت کو رواج دیا۔ دراصل وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے، بلکہ اُنھوں نے ادب کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ اُن کی تحریر میں بڑا تنوع تھا۔ اُنھوں نے مذہب، سیاست، تاریخ، ادب، فلسفہ اور منطق، ہر موضوع پر طبع آزمائی کی۔ سر سید کا اُردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ وہ زبان جو پہلے فقط حسن و عشق اور تخیلاتی دنیا تک محدود تھی، حقیقت نگاری اور اصلاح کے لیے استعمال ہونے لگی۔

آصاف: آثار الصنادید، اسباب بغاوت ہند، خطبات احمدیہ، مقالات سر سید وغیرہ

Not For Sale

حصہ غزل

شمار	عنوان	شاعر	صفحہ
1	☆ فقیرانہ آئے صدا کر چلے	میر تقی میر	161
	☆ جری میں کیا جوانی کے موسم کو روئے		162
2	☆ قتل عاشق کسی مشوق سے کچھ دور نہ تھا	خواجہ میر درد	166
3	☆ ہامہ چن میں جب وہ گل اندام آگیا	غلام ہمدانی مصحفی	168
4	☆ دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	مرزا غالب	172
	☆ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے		173
5	☆ آئینہ اپنی نظر سے نہ جدا ہونے دو	داعی دہلوی	176
	☆ فرہنگ		178



Not For Sale

اپنی مدد آپ

”خدا ان کی مدد کرتا ہے، جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔“

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے فقرے میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے، تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے جبکہ کسی شخص کے لیے یا کسی گروہ کے لیے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے، تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش، اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی، اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت، انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو، تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے عزت ہو جاتی ہے۔

آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں خواہ اپنی بھلائی اور ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں، یہ امر بدیہی اور لائبدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے ہم وطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟ ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ عمدہ انتظام قوم کی عزت، بھلائی، خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کے، ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔

ایک شخص، فرض کرو کہ پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے قومی عزت اور بھلائی اور ترقی کے لیے کیا کر سکتا ہے؟ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دے دینے سے گو کسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو،

Not For Sale

قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ بلکہ خود اس کے چال چلن پر، اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ پس یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے فوائدے عمل کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور باعمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے اور وہ فرض جان، مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جب قانون کا عمل درآمد دشمنی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمرات کا بے خطر حظ اٹھا سکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے مگر کوئی قانون گو، وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو، سست آدمی کو محنتی، فضول خرچ کو کلفتیت شعار اور شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا ہے۔ بلکہ یہ باتیں محنت، کلفتیت شعاری اور نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی، قومی عزت، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں، چال چلن اور عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ درجے حاصل کرنے سے۔

نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا، جن پر وہ حکومت کرتی ہے، عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے، اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و دانشگری میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اُس کو زبردستی پیچھے سے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کم تر دانشگری میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھینچ جاتی ہے۔ یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے، یقیناً اسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسل میں آ جاتا ہے، اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتر بیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادات، تہذیب و دانشگری پر منحصر ہے، کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مردوں، عورتوں اور بچوں کی شخصی ترقی ہے، جن

سے وہ قوم بنی ہے۔
قومی ترقی مجموعہ ہے: شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزلی
مجموعہ ہے: شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خود غرضی اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی اور بد چلنی جو
اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔
اگر ہم چاہیں کہ تیرہ دینی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں، تو یہ برائیاں کسی اور
نی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور و شور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی
حالتوں کو ترقی نہ دی جاوے۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے، تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی کچی ہمدردی اور کچی خیر خواہی
کردہ۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی کا چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو، تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ
تعلیم و تربیت کا، بات چیت کا، وضع لباس کا، سیر پائے کا، شغل اشغال کا، تمہاری اولاد کے لیے ہے، اس سے ان
کے شخصی چال چلن، اخلاق و عادات، نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلا۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے، تو اس بات کی اُمید پر
بٹھے رہنا کہ بیرونی زور، انسانوں کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے، کس قدر افسوس، بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ
شخص درحقیقت غلام نہیں ہے، جس کو ایک خدا ناترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے، خرید لیا ہے یا ایک ظالم
اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصل غلام ہے جو بد اخلاقی خود غرضی، جہالت
اور شرارت کا مٹیچ اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل
میں غلام ہیں، وہ بیرونی زوروں سے، یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں، جب تک کہ
غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔

جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی، گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام

پر منحصر ہے، اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو
کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں۔ وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں
رکھتیں، جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ مستقل اور
مضبوط آزادی، کچی عزت اور اصلی ترقی شخصی چال چلن پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن
ہے۔ جان اسٹیورٹ مل (John Stewart Mill) جو ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے، کا قول ہے کہ "ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے نہیں پیدا کر سکتی۔ اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود
ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو بد دیتی ہے درحقیقت وہی شے اس کے لیے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے
پھر اس شے کو چاہو جس نام سے پکارو۔" اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی
ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کسی ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جائے، وہ کچھ بھی عمدہ نتیجہ پیدا
نہیں کر سکتی۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خطرے، گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے
سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر
اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے، تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔
حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں، جیسے کہ صرف دولت کی
پرستش سے انسان مقید و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالہ اشرفی مل، جو ہر روز بچھی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہاد دولت
رکھتے ہیں، انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گئے جاتے ہیں؟

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے زیادہ دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے، وہ اپنی آپ مدد
کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خطر کو ڈھونڈنا بھول جاویں
گے۔ اور وہیں پر بھروسے اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی
بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجراء کی خواہش، یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈرائنگ نے دہلی کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا کہ: ”جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں، اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لیے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت، ہماری آزادی، ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کیے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ کی قومی توقع اپنی بہتری کے لیے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی دلوے اور محنت سے کام کیے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانے میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جائے گی۔“

انسان کی انگی پشتموں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوتی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں، زمین کے جوئے والوں، کانوں کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں، آلات جراثیم سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں، ہنرمندوں، شاعروں، حکیموں، فیلسوفوں، ملکی منتظمین نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر غارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی غمارت کے معمار ہیں، لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی، ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائیداد کا وارث کیا ہے، جو ہمارے پُرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائیداد ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار سرج اس کی حفاظت ہی کیا کریں، بلکہ ہم کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پُرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بھی گرا دیا۔

Not For Sale

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے، اس شخص کا اس کے زمانے میں اور آئندہ زمانے میں اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن کو معلوم نہیں ہوتا، مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی چال چلن ہی میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی، برتاؤ اور چال چلن پر قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک عمدہ عملی تعلیم ہے۔ جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسہ اور مدرسۃ العلوم (کالج) کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا، یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا، جس کو انگریزی میں ”لائف ایجوکیشن“ کہتے ہیں، انسان پر، قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرسۃ العلوم کا علم طاق میں، صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت، دوست سے ملنے میں، گھر کے رہنے سہنے میں، شہر کی گلیوں میں، صرافہ کی دکان میں، محل جوڑتے میں، کپڑا بننے کے کارخانے میں، گلوں سے کام کرنے کے کارخانے میں اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر بے سکھائے، بے شاگرد بنائے لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلا یا جاتا ہے۔

یہ پھیلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی علم سے عمل، چال چلن، تعلیم نفسی، نفس کشی، شخصی خوبی، قومی مضبوطی اور قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنادیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔

لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے: ”کہ علم سے عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا، علم سے باہر اور علم سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل، یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔“ علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن، آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

(مقالات سرسید) Not For Sale

مشق

1- "اپنی مدد آپ" کو مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں جو تین سطروں سے زیادہ نہ ہوں۔

(۱) دو کون سا آرمیڈوہ قتل ہے جس میں انسانوں اور قوموں کی ترقی کا تجربہ جمع ہے؟

(۲) سرسید کے خیال میں کون سی قوم ذلیل و بے عزت ہو جاتی ہے؟

(۳) پنچر کا قصہ کیا ہے؟

(۴) قومی ترقی کن خوبیوں کا مجموعہ ہے؟

(۵) قومی ترقی کن برائیوں کا مجموعہ ہے؟

(۶) بیرونی دشمن سے برائیوں کو ختم کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

(۷) سرسید کے خیال میں اصلی غلام کون ہے؟

(۸) دینی و محرف قوموں نے کس خوبی کی وجہ سے عزت پائی؟

(۹) دین و ایمان کے اصول کا مفہوم بیان کریں۔

(۱۰) کون سی خوبی دینی و محرف قوموں میں اب بھائی ہے؟

2- "اپنی مدد آپ" کے متن کو مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

(۱) خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں، یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ:

(ب) منقولہ ہے

(ز) محاورہ ہے

(ا) کہادت ہے

(ج) ضرب المثل ہے

(۲) ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی بچی:

(۱) ترقی کی بنیاد ہے

(ج) عزت کی بنیاد ہے

3- سبق "اپنی مدد آپ" کو پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملے مکمل کریں۔

(۱) خدا ان کی مدد کرتا ہے جو..... مدد کرتے ہیں۔

(ب) جس طرح پانی خود..... میں آ جاتا ہے۔

(ج) قوم شخصی..... کا مجموعہ ہے۔

(د) قوم کی بچی..... کرو۔

(۵) ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ..... ملے۔

4- سبق "اپنی مدد آپ" کا مرکزی خیال لکھیں جو پانچ جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

5- سرسید کے مضمون "اپنی مدد آپ" کا خلاصہ لکھیں۔

6- سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح لکھیں۔

قومی ترقی مجموعہ ہے..... حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

محاورہ اور روزمرہ:

جب دو یا دو سے زیادہ الفاظ حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوں تو وہ محاورہ کہلاتا ہے۔ مثلاً آنکھیں دکھانا، آنکھوں سے گرانا، آنکھیں بچھانا، نو دو گیارہ ہونا اور تارے گننا وغیرہ۔ روزمرہ اہل زبان کے بول چال کا نام ہے۔ روزمرہ میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ قواعد کی حدود میں آتا ہے جب کہ روزمرہ قواعد سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسی طرح محاورے میں تبدیلی نہیں ہوتی جب کہ روزمرہ اہل زبان کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ



وفات: نومبر ۱۹۱۰ء

پیدائش: ۱۸۳۲ء

مولوی ذکاء اللہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام ثناء اللہ تھا۔ بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کا ساتھ ہو گیا اور ان تینوں میں بڑے تعلقات پیدا ہو گئے۔ مولوی ذکاء اللہ کو ریاضی سے خاص مناسبت تھی۔ ماسٹر رام چندر ریاضی کے استاد تھے اور اپنے اس لائق شاگرد پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ ذکاء اللہ اکثر اول آتے، وظیفے حاصل کرتے تھے۔ دو تھے بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر حاصل کیے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہو گئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات سال تک اردو اور فارسی کے معلم رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ء میں ہارل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ تین سال کے بعد اورینٹل کالج کی کچھجاری کے لیے پروانہ تقریر یا لیکن اتفاق سے اس کے ساتھ ہی میونسٹرل کالج آباد کی پروفیسری بھی انھیں پیش کی گئی۔ انھوں نے اللہ آباد کو ترجیح دی اور ۱۸ سال اس کالج میں فارسی کے پروفیسر رہ کر ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی۔ پھر عمر کے باقی ۲۳ سال خانہ نشین رہ کر تقیہ و تالیف میں گزار دیے۔

ان کی وفات کے بعد بنی نذیر احمد کا ایک مضمون، ان کے متعلق، رسالہ تمدن دہلی (بابت اگست ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولوی ذکاء اللہ کے بعض خاص حالات لکھے گئے ہیں۔ اس مضمون کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

”بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آج تک پیدا نہ کر سکیں۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے، تو میں انھیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجہ تکمیل کو پہنچ کر و ماذلک علی اللہ بعزیز، ان جیسے عالم پیدا کرے گی: کریم انفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ، متوقف المعلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہ عامہ، فاضل طبع۔۔۔ راسخ الاعتقاد، صلح کل، مرجع المرنج۔“

تقدیر: تاریخ ہندوستان، مکتبہ قیسری، فریٹ فریم وغیرہ

Not For Sale

مولوی ذکاء اللہ

جھوٹے آدمی

ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ: ”دروغ گورا حافظہ نباشد“، مگر عقل یہ کہتی ہے کہ جب آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو، وہ جھوٹ کا بیج پیو پار نہیں کر سکتا اور دروغ کو فروغ نہیں دے سکتا۔ خواہ اول صورت ہو یا دوسری، دونوں میں جھوٹ اور حافظے میں ایک تعلق ہے۔ حافظہ ایسی قوت ہے جس کو افلاطون نے تمام قوائے عقلیہ کا دیوتا کہا ہے۔ یعنی تمام ملکات نفسانی کا رئیس ہے اور سب اس کے خادم ہیں۔ اہل فرانس کو جب کسی کو پرلے درجے کا کون کہنا ہوتا ہے، تو اس کو کہتے ہیں کہ وہ حافظہ نہیں رکھتا ہے۔ حافظے کے نہ ہونے سے آدمی کو اپنے وعدے یا دہنیں رہتے اور باتیں بھول جاتا ہے۔ ایک ہی کہانی کو بار بار رات ہی دفعہ کہتا ہے کہ خواہ وہ کیسی دلچسپ ہو، اُس سے دل پھر جاتا ہے۔ ایک ہی کتاب خواہ کتنی دفعہ پڑھی ہو، وہ اس کو ہر دفعہ نئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ ایک چیز کو خواہ کتنی دفعہ دیکھا ہو، وہ اس کو انوکھی معلوم ہوتی ہے۔

اب سنو کہ ایک جھوٹے تو وہ ہوتے ہیں کہ بات تو جھوٹ کہتے ہیں، مگر وہ اپنے صدق دل سے اس کو سچا جانتے ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹے ہیں کہ جھوٹی بات کہتے ہیں اور اس کو خود دل میں جھوٹ جانتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ اور لوگ اس کو سچ جانیں۔ ہم آگے اسی قسم کے جھوٹوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان جھوٹوں کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ اپنے دماغ سے ایک جھوٹی بات کو سر سے پاؤں تک تراش کر ایجاد اور اختراع کریں۔ دوسرے یہ کہ ایک سچی حکایت کا بھی بدل کر اپنے خیال کے موافق بدل بدل کر اس طرح بیان کریں کہ وہ جھوٹ ہو جائے۔ اس صورت میں مشکل ہے کہ ان کا جھوٹ چھپا رہے اور کسی نہ کسی دن ان کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اس لیے کہ جھوٹوں نے سچی حکایت کو جھوٹ بنایا ہے، اس کی بنا، راستی پر ہے جس کا نقش اول ان کے حافظے پر جما ہے اور جس کی بنیاد دل میں زیادہ مستحکم اور استوار، اُن کے اختراعی جھوٹ سے پڑی ہے۔ قاعدہ ہے کہ سچ کے

Not For Sale

برابر جھوٹ کی بنیاد مستحکم نہیں ہو سکتی، اس لیے ضروری ہے کہ ان کے دروغ میں راستی اپنا فروغ دکھائے اور جس سچ پر جھوٹا طبع چڑھایا ہے اس کی قلعی کھل جائے اور وہی راستی جو ان کے دل کے اندر دوڑ رہی ہے، ان کے ذہن سے اس اختراعی جھوٹ کو نکلا دے۔

دوسری صورت جس میں ایک جھوٹی بات کو سننے سے گھڑ کر اختراع کرتے ہیں۔ اس کے متضاد کو کئی چچی بات ایسی دل پر منبش نہیں ہوتی کہ وہ اس سے جنگ زرگری کرے۔ پہلی صورت میں تو سچ کو جھوٹا لباس پہنایا تھا، اس کا لباس آثارِ کمال حقیقت کا دیکھ لینا آسان تھا، مگر دوسری صورت میں جھوٹ کا پتلا بنایا ہے، یہاں جھوٹ کے پکڑے جانے کا خوف کم ہے، مگر اس کے ساتھ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر حافظے میں اس پتلے کے بنانے کی ترکیب خوب جانشین نہیں ہے، تو وہ ذہن سے نکل جائے گی، پھر قلعی کھل جائے گی۔

تم نے بہت سے آدمی دیکھے ہوں گے کہ وہ جیسا وقت اور موقع دیکھتے ہیں، ویسی باتیں بنا دیتے ہیں، کچھ جھوٹ سچ کا خیال نہیں کرتے۔ ایک ہی معاملے میں ایک شخص سے کچھ کہہ دیتے ہیں، اُس کی جانب مخالف سے کچھ اور فرمادیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کوئی بات ایمان اور صداقت کے ساتھ مستحکم نہیں ہوتی۔ فقط یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کی مرضی کے موافق باتیں بنا کے ان کا دل خوش کر دیں۔ ایسی باتوں کے کرنے سے وہ اپنا نام صلح کھل رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی ساری باتوں کو، جو ایک معاملے میں کرتے ہیں، لکھ لے اور اس کو غور سے دیکھے، تو معلوم ہوگا کہ ان کی باتیں کیسی فریب اور دغا سے بھری ہوئی ہیں، جس کا نام انھوں نے صلح کھل رکھا ہے، وہ سراسر نفاق ہے۔ جب ایک آدمی کسی ایک ہی معاملے میں مختلف اوقات میں، مختلف پیرایوں میں اظہارِ رائے کرتا ہے اور اصل حقیقت اس کے دل میں کچھ نہیں ہوتی، تو ان سب کا یاد رکھنا حافظے کی قدرت سے باہر ہو جاتا ہے، اس لیے وہ اپنی کبھی ہوئی بات کو بھول جاتا ہے اور اس کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اسی معنی کو کہا کرتے ہیں کہ: ”دروغ گور حافظہ نباشد۔“

سیدھی سادی چچی باتوں میں جھوٹ بولنے کے برابر کوئی لعنت کی ماری ہوئی بُرائی نہیں ہے۔ ہم انسانوں میں جو باہم رشتہ مندی ہے، وہ فقط نطق کے سبب سے ہے۔ جب اس نطق میں کذب شامل ہو، تو انسانوں کے

باہمی تعلقات میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی کہ جو فساد سے خالی ہو۔ جن قوموں میں جھوٹ کا رواج ہو گیا ہے، اُن میں کوئی بُرائی باقی نہیں، جو نہ ہو۔ یہ جھوٹ، آگ اور تلوار سے زیادہ ان کا نقصان کر رہا ہے۔

اکثر ماں باپ اپنے بچوں کو ان کی معصوم خطاؤں پر اور بے باک شوخیوں اور گستاخیوں پر خوب گوشمالی کرتے ہیں، مگر وہ یہ یاد رکھیں کہ بچوں کو صرف ان دو قصوروں پر سزا دینی چاہیے، ایک جھوٹ پر اور دوسری سرکشی پر۔ جب تک کہ ان دونوں بُرائیوں سے ان کو وہ نہ پھٹھائیں، سزا دینے سے ہاتھ کو نہ اٹھائیں۔ اگر جھوٹ کا چسکا اس عمر میں زبان کو لگ گیا، تو وہ بڑے ہونے پر اور بڑھے گا۔

بعض بھلے مانسوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے سننے کی بیماری ان کے پیچھے لگی ہوتی ہے۔ اپنے شخص و تعلق کی داستانیں نثر میں ایسی ہی گھڑا کرتے ہیں، جیسے کوئی شاعر اشعار میں جھوٹا مضمون گانٹھتا ہے۔ اگر یہ عیب ان میں نہ ہو، تو پھر ان کے بے عیب ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہتا۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، مگر ہاں! وہاں جہاں اُن کو کچھ فائدہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر دکان داروں اور اہل پیشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سب طرح بھلے مانس ہوتے ہیں، مگر اپنے پیشے میں اپنے فائدے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں، مثلاً: دکاندار چیزوں کا بھاد جھوٹا بتلاتے ہیں، وکلاء مقدمات جھوٹے لڑتے ہیں۔ ایسے جھوٹ کو نہ وہ خود بولنے والے بُرا جانتے ہیں، نہ اس کو لوگ بُرا سمجھتے ہیں۔

(محاسن الاخلاق)

۱۔ جھوٹے آدمی کے حافظے کے بارے میں مولانا ذکا اللہ نے جو ضرب المثل بیان کی ہے۔ اُس کا مفہوم بیان کریں۔

۲۔ کس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کو اپنے وعدے یا دہنیں رہتے؟

۳۔ مصنف نے جھوٹوں کی کتنی قسمیں بیان کی ہیں؟

۴۔ انسانوں میں باہمی رشتہ مندی کس سبب سے ہے؟

۵۔ جھوٹ سے بچ کا جاننا کیوں مشکل ہوتا ہے؟

۶۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

اختراتی بصیرت - تشبہ اول - جتنی حکایت - اندیشہ - جانشین - منش - ملکات نفسانی -

۷۔ جھوٹے لوگوں کی جو خصلتیں مصنف نے بیان کی ہیں۔ انہیں مفصل لکھیے۔

۸۔ ”جھوٹے آدمی“ میں جو مرکبات مستعمل ہیں، اُن کی نشاندہی کریں۔

۹۔ مرکب مصادر کے کہتے ہیں؟ پانچ مرکب مصدر تلاش کر کے لکھیں۔

املا اور تلفظ :

املا اور تلفظ میں وہی صورت اختیار کی جائے جو اہل زبان میں رواج پائی ہو۔ یعنی اُردو میں بات کرتے ہوئے اُردو ہی کا ”لب و لہجہ“ اختیار کیا جائے، چاہے وہ عربی زبان کے الفاظ سے متعلق ہو، انگریزی یا کوئی اور زبان۔ تاہم یہ اصول قرآن مجید اور احادیث مبارکہ پر لاگو نہیں ہوتا۔



وفات: ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء

پیدائش: ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان جبل پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام گلاب خان تھا، جو نسلاً پٹھانوں کے یوسف زئی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم جبل پور سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سے اُنھوں نے فارسی، اردو اور قانون کا امتحان پاس کیا اور امراتوٹی کالج ناگ پور میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی چلے آئے۔ یہاں وہ پہلے اردو کالج اور پھر سندھ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بے شمار سرکاری و غیر سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی سطح پر لکھے جانے والے کئی مقالات کے مرتب رہے۔

اردو تحقیق کی روایات کو مستحکم کرنے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا اہم کردار ہے۔ اُنھوں نے خود بھی گراں قدر خدمات انجام دیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کی سرپرستی بھی کی۔ اُنھوں نے زبان کے ساتھ ادبی اثرات کی دریافت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں معنی اور مطلب کی پوری وضاحت کر دیتے تھے۔ دینی معلومات ہوں، علمی، ادبی یا تحقیقی، ان کا انداز بیان توضیحی اور تشریحی تھا۔ وہ دقیق خیالات کو بڑی آسانی اور روانی سے قلم بند کرتے تھے۔ انکسار اور سادہ بیانی ان کے اسلوب کا حصہ ہے۔ فارسی میں ان کی مہارت مُسلم الثبوت ہے۔

تصانیف: علمی نقوش، تاریخ اسلاف، ادبی جائزے، تحقیقی جائزے، تاریخ بہرام شاہ، سرگزشتِ کابل، چند فارسی شعرا، برصغیر میں فارسی ادب، اقبال اور قرآن، معارف اقبال، مطالب اقبال، مقدمات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ہمارا تلفظ، جامع القواعد وغیرہ۔

نظریہ پاکستان

مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری کو اپنا شیوہ بنایا ہے لیکن جب کفر و الحاد اپنا غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو مسلمان اس کے مقابلے کے لیے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اکبر کی بے جا رواداری اور ملکی سیاست میں ہندوؤں کے عمل دخل کی وجہ سے ملک میں کافرانہ طور پر لپٹے اس قدر رائج ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کی آزادی خود ان کے دینی معاملات میں بھی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اکبر کے آخری دور میں اسلام کی سر بلندی کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ کھڑے ہوئے۔ آپ نے جہانگیر کے زمانے میں محض دین کی خاطر قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اسلامی قدروں کو سننے سے سرفروغ دیا۔ ان کے اثر سے شاہ جہاں اور اس کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب، دین کا خادم بنا لیکن اورنگ زیب کے بعد ہی اس کے بیٹوں کے باہمی تفریق اور کمزوری کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ مرہٹوں اور ہندوؤں کے کئی گروہوں نے سر اٹھایا؛ انگریزوں نے اپنے قدم جمائے اور ملک میں انتشار پھیل گیا لیکن ایسے گئے گزرے حالات میں بھی قوم کو فروغ دینے اور اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے کوششیں جاری رہیں۔ چنانچہ میسور کے سلطان حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں کا مقابلہ کیا بلکہ افغانستان، ترکی اور پھر فرانس کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی لیکن ملک کے دوسرے سرداروں نے ساتھ نہیں دیا اور انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے صاحبزادوں نے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کی تحریک شروع کی۔ پھر ان کے پوتے شاہ اسماعیل نے اپنے مرشد سید احمد بریلوی کے ساتھ اسلامی اصولوں کو دوبارہ رائج کرنے اور ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش میں ۱۸۳۱ء میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تاہم انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

Not For Sale

میں مسلمانوں نے پھر اپنے قدم جمائے کی کوشش کی لیکن انگریزی اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اس لیے انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں سرسید نے مجبوراً انگریزوں سے مفاہمت کو غنیمت جانا اور مسلمان قوم کی اخلاقی اور تہذیبی اصلاح پر توجہ دی اور ان کے دلوں سے احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۸۵۵ء میں ہندوؤں نے کانگریس کی بنیاد ڈالی اور ظاہر یہ کیا کہ وہ ملک کی تمام قوموں کو ان کے حقوق دلوائیں گے لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ صرف اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے کاروبار سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی اور وہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہو گئے، نیز انھوں نے مسلمانوں کی مشترکہ زبان اردو کے مقابلے میں ہندی کو قائم کر دیا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس کانگریس اور ان کی سیاست سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی اور ان کے ایک دوست مولانا محمد قاسم نے دیوبند میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ پھر سرسید کے ایک رفیق نواب وقار الملک نے ۱۹۰۶ء میں کل ہند مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ یہ تنظیم ڈھاکے میں قائم ہوئی تھی، جہاں ہندوؤں نے سازش کر کے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے مشرقی بنگال اور آسام کا وہ صوبہ، جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ختم کر دیا اور ۱۹۱۱ء میں اسی علاقے کو پھر بنگال میں شامل کر دیا۔

اسی زمانے میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی، جس میں انگریز کا مقابلہ جرمنی سے ہوا اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان چونکہ ترکی کے سلطان حجاز کی خدمت کرنے کی وجہ سے خلیفہ اسلام سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے مالی اور طبی امداد بھجوا کر پہنچائی جس کی وجہ سے حکومت برطانیہ کو مسلمانوں سے عناد پیدا ہو گیا لیکن انھوں نے یہاں کے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا کہ اگر ہمیں اس جنگ میں فتح حاصل ہوگی، تو ہم کسی طرح بھی ترکی کو مزید نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہ وعدہ محض فریب تھا۔ چنانچہ جب انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی، تو وہ اپنے وعدے سے پھر گئے اور انھوں نے ترکی کی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہاں کے مسلمانوں کو اس فریب کی وجہ سے بہت تکلیف پہنچی اور انھوں نے خلافت کے تحفظ کے لیے مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کی رہنمائی میں تحریک خلافت شروع کی، لیکن اسی زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے

Not For Sale

لیے شادی کی تحریک شروع کی اور ان کو فتح کرنے کے لیے مسٹنٹس کی تحریک بھی شروع کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے جو نہرو رپورٹ شائع کی، اس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی کا اصول جو وہ بارہ سال پہلے تسلیم کر چکی تھی، بالکل نظر انداز کر دیا۔ پھر تو مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا اور انھیں یقین ہو گیا کہ چونکہ ان کا دین، ان کی تہذیب اور ان کی معاشرت سب کچھ غیر مسلموں سے مختلف ہے، اس لیے کسی حالت میں ہندوؤں سے تعاون نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد والے اجلاس میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن (پاکستان) بنانے کی تجویز پیش کی۔ چار سال کے بعد جب قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت کا مستقل عہدہ قبول کیا، تو انھوں نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کر دی۔ آخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو انھوں نے لاہور کے اجلاس میں واضح طور پر اعلان کر دیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں ایک آزاد مسلم ریاست قائم کی جائے۔ اس اعلان کو ”قرارداد پاکستان“ کہتے ہیں، جس کی زور سے مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا میں قومیت کی تشکیل کی دو بنیادیں ہیں: ایک وہ جو مغربی مفکرین نے قائم کی ہے اور دوسری وہ جو رسول مقبول ﷺ کی قائم کی ہوئی ہے۔ اہل مغرب نے خاندانی، نسلی اور قبائلی بنیادوں میں ذرا وسعت پیدا کر کے قومیت کی بنیادیں جغرافیائی حدود پر استوار کیں اور قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس نظریے کی وجہ سے دنیا کے انسانوں کے درمیان تباہی کا جو دروازہ کھلا، وہ دو عالمی جنگوں کے ہونے سے بخوبی ظاہر ہے۔ یہ وطنی قومیت ہی کی بنیاد پر لڑی گئی تھیں اور یہ وطنی قومیت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو تحفظ دینے میں تو بالکل ہی ناکام تھی، کیونکہ جنوبی ایشیا کے مسلمان اس نظریے کے تحت ایک مجبور اقلیت بن جاتے۔

قومیت کی دوسری بنیاد وہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے ملت اسلامیہ کی تشکیل کرتے وقت قائم فرمائی اور جو مغرب کے تصور قومیت سے جدا ہے، جیسا کہ علامہ اقبال نے بھی فرمایا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی

Not For Sale

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

مسلمانوں کی قومیت ایک نظریاتی قومیت ہے، جو لا الہ الا اللہ پر قائم ہے، یعنی یہ کہ نسل، رنگ اور وطن کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ایک نظریے، ایک عقیدے اور ایک کلمے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اور اس نظریاتی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے، اسے ملت کہا گیا ہے۔ ایسی نظریاتی قومیت میں ہر نسل، ہر رنگ اور ہر جغرافیائی خطے کے لوگوں کے لیے جگہ ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو، جن میں ہر نسل، ہر رنگ اور مختلف جغرافیائی خطوں کے لوگ شامل تھے، ایک ایسی قوم کے ماتحت اقلیت بن کر رہنا منظور نہ تھا، جو اسلامی قومیت کے برعکس ذات پات، چھوت چھات اور بت پرستی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جداگانہ قومیت، یعنی اسلامی قومیت کی بنیاد پر اپنے لیے ایک جدا وطن کا مطالبہ کیا، جس میں وہ اپنے عقیدے، اپنے نظریے زندگی، اپنے طرز معاشرت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے دور جدید کے چیلنج کا مقابلہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔

ہمیں اس بات کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ نظریہ پاکستان میں اسلامی زندگی اور قدروں کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اخوت، مساوات، عدل، دیانت، خدا ترسی، انسانی ہمدردی اور عظمت کردار کے بغیر نظریہ پاکستان کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ نظریہ پاکستان کا مقصد محض ایک حکومت قائم کرنا نہیں تھا، کیوں کہ مسلمانوں کی حکومتیں ایشیا اور افریقہ میں پہلے سے موجود تھیں۔ نظریہ پاکستان کا مقصد اسلامی اصولوں کی ترویج و اشاعت اور اہل عالم کے لیے مثالی مملکت کا نمونہ فراہم کرنا ہے۔

پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ ہندوؤں کو بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ مملکت قائم نہ ہونے پائے۔ ان کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ جنوبی ایشیا میں ان کی اکثریت تھی، لیکن چون کہ قیام پاکستان کا مطالبہ حق اور انصاف پر مبنی تھا، اس لیے حکومت برطانیہ کو مجبور ہونا پڑا اور قائد اعظم محمد علی جناح کی پُر خلوص قیادت، مسلمانوں کے یقین، اتحاد اور عمل پیہم کی وجہ سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

Not For Sale

نظریہ پاکستان کا مقصد پاکستان کو ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بنانا ہے۔ ہمیں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے، جس کی وجہ سے خدا اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ ہمارا جینا اور مرنا پاکستان کے لیے ہونا چاہیے، قومی مفاد کے سامنے ذاتی مفاد کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ ہر قسم کی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر تمام پاکستانیوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنا، نظریہ پاکستان کو فروغ دینا ہے۔ اگر ہم نے نظریہ پاکستان کو پیش نظر رکھا اور اپنی سیرت اور کردار کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، تو دنیا کی دوسری قوموں میں بھی ہمیں امتیاز حاصل ہوگا اور ہم اسلامی اصولوں کی روشنی میں پاکستان کو توانا، مستحکم، شاندار اور پُر عظمت بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

مشق

- ۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں۔
 - (۱) بادشاہ اکبر کی بے جا رواداری سے کیا نقصان ہوا؟
 - (ب) مجدد الف ثانی نے اسلام کی کیا خدمت انجام دی؟
 - (ج) حیدر علی اور سلطان ٹیپو انگریزوں کے خلاف جنگ میں کیوں ناکام ہوئے؟
 - (د) کنگرئیس کا قیام کب عمل میں آیا اور اس کے بنیادی مقاصد کیا تھے؟
 - (ه) شجی اور سنگھن جیسی انتہا پسند تحریکیں چلانے کا مقصد کیا تھا؟
 - (و) نظریہ پاکستان سے کیا مراد ہے؟
 - (ز) نظریہ پاکستان کے مقاصد کے حصول کے لیے آپ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟
- ۲۔ درست جواب کا انتخاب کریں۔
 - (۱) مصنف کے خیال کے مطابق مسلمانوں نے ہمیشہ کس چیز کو اپنا شیوہ بنایا؟
 - انسانیت
 - رواداری
 - صداقت

Not For Sale

(ب) مجدد الف ثانی نے کس کے عہد میں سختیاں جھیلیں؟

- جہانگیر
- اکبر
- اورنگزیب

(ج) شاہ اسماعیل کا شاہ ولی اللہ دہلوی سے رشتہ تھا:

- بھائی کا
- والد کا
- پوتے کا

(د) تحریک خلافت کے رہنما تھے:

- مولانا شوکت علی
- مولانا محمد علی جوہر
- دونوں

(ه) مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کی ناپاک تحریک کا نام تھا:

- آریہ سماج
- سنگھن
- شجی

(و) آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا:

- ۱۹۰۳ء میں
- ۱۹۰۵ء میں
- ۱۹۰۶ء میں

(ز) اقبالؒ نے سب سے پہلے خطبہ الہ آباد میں آزاد وطن کا نظریہ پیش کیا:

- ۱۹۰۳ء میں
- ۱۹۳۰ء میں
- ۱۹۳۵ء میں

(ح) نہرو رپورٹ شائع ہوئی:

- ۱۹۲۳ء میں
- ۱۹۲۸ء میں
- ۱۹۲۹ء میں

۳۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

کفر و الحاد، رائج، تہذیبی اصلاح، خلیفہ اسلام، قومیت، مثالی مملکت، انتشار، مستحکم، معرشت و جود۔

۴۔ اس مضمون سے کم از کم پانچ ایسے جملے تلاش کر کے لکھیں جن میں امدادی فعل کا استعمال ہو۔

۵۔ ”نظریہ پاکستان“ کا خلاصہ تحریر کریں۔

سرگرمی: نظریہ پاکستان اور موجودہ مسائل کے موضوع پر طلبہ کے مابین مکالمہ کرائیں۔

Not For Sale

ڈاکٹر سید عبداللہ



وفات: ۱۳ اگست ۱۹۸۶ء

پیدائش: ۵ اپریل ۱۹۰۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ ضلع مانسہرہ کے گاؤں منگور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ قرآن مجید کے ساتھ اردو کی درسی کتب، حساب، خوش خطی، ابتدائی فارسی اور خطوط نویسی کی تعلیم گھر پر پائی۔ پھر مقامی سکول میں داخلہ لے کر مڈل پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں میٹرک کا امتحان انھوں نے اسلامیہ ہائی سکول لاہور سے پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ایف اے اور ۱۹۲۶ء میں بی اے کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے فارسی کیا۔ یہاں انھوں نے پروفیسر حافظ محمود شیرانی، قاضی فضل حق اور پروفیسر اسماعیل جیسے اساتذہ سے فیض پایا۔ ۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی کا امتحان بھی امتیاز سے پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں ہی جرمن سٹوڈنٹس اور ۱۹۳۳ء میں لائبریری سٹوڈنٹس کے امتحان پاس کیے۔ سید عبداللہ پنجاب یونیورسٹی میں عربی اسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی تقرری اورینٹل کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں وہ شعبہ اردو میں منتقل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں اسی شعبے میں پروفیسر اور پھر صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پرنسپل کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ انھیں اردو سے بے پناہ لگاؤ تھا اور وہ دن رات، بلکہ آخری سانس تک اردو کے نفاذ کے لیے کوشاں رہے۔ ۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ کئی ماہ اس مرض میں مبتلا رہنے کے بعد آخر یہ نامور استاد، ادیب، صحافی، عالم اور محسن اردو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

تصانیف: نقد میر، مرثیہ اور ان کے رفقا، جہتی سے عبدالحق تک، مباحث اور اشارات تنقید وغیرہ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

پاکستانی قومیت کا مسئلہ

پاکستانی قومیت ابھی تک کچھ بوجھ بھارت قسم کی چیز ہے جس کی پہیلی بوجھنے اور اس کو سمجھانے کے لیے ہمارے مقررین اور محرموں کو چودہ برس گزر جانے کے بعد بھی شب و روز مصروف رہنا پڑتا ہے، حالانکہ قومیت کا یہ سوال ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی حل ہو چکا تھا اور پاکستانیوں کی الگ قومیت کی دلیل اتنی محکم اور اتنی واضح تھی کہ انگریزوں اور ہندوؤں کی کوئی جھجکاوتی بازی اس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکتی تھی اور یہ ماننا ہی پڑا تھا کہ پاکستان کے لیے جدا قومیت کا جو سوال اٹھایا جاتا ہے وہ سو فی صد واضح اور قطعی چیز ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہذا یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پاکستانی قومیت کی اب پھر تعریف پوچھی جانے لگی ہے، گویا کہ قوم کو ابھی خود بھی معلوم نہیں کہ ہم قوم بھی ہیں یا نہیں اور اگر ہیں، تو پھر ہماری قومیت کا ہمارے پاس ثبوت کیا ہے؟ اگر تحریک پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو ایک بات اس کی ہر منزل پر صاف صاف ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ یہ تحریک مسلمانان ہندوستان کی متفقہ تحریک تھی، جو اس لیے اٹھائی گئی تھی کہ مسلمانوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مشترکہ ہندوستان میں ان کی روایات، ان کی زبان اور ان کے مخصوص طرز زندگی کے زندہ رہنے کے امکانات کم ہوں گے اور انھیں یہ ڈر تھا کہ کسی مشترکہ نظام میں ان کی ساری تہذیبی ہستی مٹ جائے گی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اپنی تہذیب اور زندگی کے اس نقطہ نظر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، جس کی بنیاد دین اسلام پر قائم تھی۔ گویا مسلمانان ہندوستان اپنی ہزار سالہ تہذیبی وراثتوں کو مشترکہ نظام کے خطروں سے بچانے کے لیے مضطرب تھے۔

اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ پاکستانی قومیت سب سے پہلے تو ان عقیدوں سے عبارت ہے، جن کا مرکزی نکتہ، اسلام اور اس کا دیا ہوا تصور حیات اور نظام زندگی ہے، پھر اسی کے پہلو بہ پہلو، ان تہذیبی

دراشوں کے تحفظ کا عقیدہ بھی ہے، جن کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں محفوظ کرنے یا ترقی دینے کی گنجائش نہ تھی! یہ تو ہے مرکزی عقیدے اب ان کے ہمراہ پاکستانی قومیت کے جغرافیائی تقاضوں اور حدوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے، کیونکہ قومیت کی ایک مسلمہ بنیاد کوئی خطہ یا وطن بھی ہے۔ اگر قومیت کے مسئلے کو ایک تشبیہ کی صورت میں سمجھا جاتا ہو، تو ہم یہ کہیں گے کہ قومیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ جس طرح کسی پھل یا پھول کا ظاہر بھی ہوتا ہے اور باطن بھی اور وہ پھل یا پھول ان دونوں کے مجموعے سے بنتا ہے، اس قیاس پر پاکستانی قومیت کی روح یا اس کا باطن تو وہ تخیل ہے، جو اس کی تعمیر کا محرک ہوا، مگر اس کا بدن بھی ہے اور وہ خطہ یا ملک ہے، جس کی جغرافیائی حدیں مقرر ہیں اور اب اس کا نام پاکستان ہے۔

اس تشبیہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کی روح، یعنی اس کا تخیل تبھی زندہ رہ سکتا ہے، جب روح کے ساتھ بدن کی بھی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح اس کا بدن تب ہی صحیح معنوں میں ایک زندہ ہستی بن سکے گا، جب اس کے اندر کی روح سالم اور برقرار رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح پاکستانی قومیت کے مرکزی عقیدے یعنی (اسلامی تخیل) کو بحکم بنانا اور محفوظ رکھنا لازمی ہے، اُس طرح اس تخیل کو اس کے جغرافیائی تخیل سے وابستہ رکھنا بھی لازمی ہے، اس لحاظ سے پاکستانی قومیت کا دوسرا بڑا عنصر وطن یا وطنیت ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر دو سوال ہمارے سامنے آتے ہیں، جو بعض اوقات بڑے پریشان کن ثابت ہوتے ہیں۔ ایک سوال تو یہ ہے کہ جب اسلام میں جیسا کہ اقبال نے کہا ہے: وطن پرستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا تو پھر قومیت کے جغرافیائی تخیل کو ہم اسلامی تخیل کے ساتھ ساتھ کس طرح اپنا سکتے ہیں؟ دوسرا شوشہ یہ چھوڑا جاتا ہے کہ جب پاکستانی قومیت کا مرکزی عقیدہ اسلام ہے اور اس قومیت کے محرک مسلمان ہی ہیں تو اس صورت میں غیر مسلموں کے لیے پاکستان میں رہنے اور اُس میں ایک وفادار شہری بننے کی مجبوری کیوں؟

میرے خیال میں یہ دونوں سوال جتنے پریشان کن ہیں، ان سے زیادہ گمراہ کن ہیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ ہر زندہ قومیت میں جغرافیائی بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، بلکہ یوں کہیں کہ اس میں قومیت کا اولین ظاہری نشان اس کا جغرافیہ ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس کا اصل محرک اس کا اندرونی عقیدہ یا Myth تخیل ہی ہوتا ہے مگر کوئی قوم صحیح

معنوں میں قوم تب ہی بنتی ہے جب اس کی جغرافیائی حدیں بھی موجود ہوں۔ اسلام کا مرکزی جغرافیہ جزیرۃ العرب ہی تھا، پھر جب اسلام باقی ملکوں میں پھیلا، تو اس کی جغرافیائی حدیں بھی وسیع ہوتی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ اصل محرک ہر حالت میں عقیدہ ہی تھا، مگر عقیدہ، جغرافیہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتا گیا۔ چنانچہ عام مسلمانوں کے تصور میں اب بھی اسلام اور خدا کی زمین کی بادشاہت لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی گروہ بے مملکت بھی ہو سکتا ہے، مگر بے مملکت مسلمان، یا محکوم ہوں گے، یا بکھرے ہوئے افراد ہوں گے، ان پر قوم یا زندہ قوم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسلامی اجتماعیت کا اولین تصور جغرافیائی مملکت سے وابستہ ہے۔ اسلام محض آسمانی یا روحانی مملکت کا قائل نہیں، وہ اپنے عقیدے کے نفاذ کے لیے ایک ملک کا طالب ہے اور اسی کو عرف عام میں وطن کہتے ہیں۔

اسلامیت اور وطنیت میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ اسلامیت کی تکمیل وطنیت سے ہوتی ہے۔ وطن اور مملکت کے بغیر اسلام محض خیالی چیز اور ایک طرح کی رہبانیت بن جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے جس وطنیت کی مخالفت کی ہے، وہ یورپ کی وطنیت (Nationalism) ہے جس کی ایک مخصوص اور طویل تاریخ ہے اور ایک لحاظ سے یہی وطنیت، انسانیت کے لیے بے شمار مصائب کا سرچشمہ رہی ہے اور اب تک ہے۔ علامہ اقبال اسی کے مخالف تھے اور بجا طور پر مخالف تھے، مگر ان کے افکار میں جغرافیائی مملکت کی مخالفت کا سراغ کہیں بھی موجود نہیں۔ ان کے نظام فکر میں جس طرح کوئی مملکت نظام عقائد کے بغیر، بربریت اور بدتہذیبی ہے، اسی طرح کوئی نظام عقائد، بے مملکت، رہبانیت سے کم نہیں اور یہ چیز اسلام کے عملی تصور رات کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ”پس چہ باید کرداے اقوام شرق“ اور ”جاوید نامہ“ میں ایشیائی مملکتوں کو زیادہ قوی بنانے کی تلقین کی ہے۔

معلوم نہیں کس نے بے خیالی میں یہ بے پردگی اڑادی تھی کہ اقبال سرے سے وطنیت کے مخالف تھے۔

اقبال، عقائد اور وطن کی وحدت میں گہرا عقیدہ رکھتے تھے اور وہ وطن کے صرف اُس تصور کے مخالف تھے کہ جس کی بنیاد، مغرب نے چھوٹے چھوٹے نسلی تعصبات اور مادہ پرستی کی تفریق پر قائم کی تھی اور جس سے نسلی قومیت ابھری۔ پھر یہ چھوٹی چھوٹی نسلی اقوام ایک دوسرے سے لڑنے بھڑونے لگیں اور Militarism کی وہ

شکل پیدا ہوئی جس کے باعث دنیا میں دو فتنہ انگیز جنگیں ہوئیں اور انسانیت کے لیے بڑے بڑے مصائب کا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔

بعض لوگ بددیانتی سے یا سادگی سے، پاکستان میں خُب الوطنی کے پردے میں علاقہ پرستی کی تحریک چلا رہے ہیں، مگر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ علاقہ پرستی اور وطنیت میں بڑا فرق ہے۔ یوں عام حالات میں کسی شخص کا کسی خاص علاقے سے محبت رکھنا یا اس کے متعلق اچھے جذبات رکھنا بالکل فطری امر ہے مگر اس علاقائی محبت کا وطن کے وسیع مفادات سے ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے ورنہ علاقہ پرستی ایک ایسا مرض ثابت ہو سکتا ہے، جو وطن عزیز کی ہستی کے لیے خطرناک ہوگا۔ اس قسم کی علاقہ پرستی کو میں پاکستانی قومیت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتا ہوں جس میں کوئی شخص قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی علاقائی وفاداریوں کا اتنا پابند اور عادی ہو جائے کہ خطے پر قوم ہی کو قربان کر دے۔

پاکستان میں بہت سی نسلیں آباد ہیں اور بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان نسلی گروہوں میں بہت سی خوبیاں ہیں اور ان زبانوں کے ادب میں ہمارے لیے بہت سا قابل قدر سرمایہ فکر و تہذیب موجود ہے، مگر ملکی قومیت ہر خطے کے لوگوں سے یہ قربانی مانگتی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو خطے کی خدمت کرتے وقت بھی وسیع تر قومی نقطہ نظر کے تابع رکھیں ورنہ ڈر ہے کہ کسی کمزوری کے وقت یا کسی غیر ملکی سازش یا عقیدے سے متاثر ہو کر یہ خطہ پرستی پاکستان کے شیرازے کو منتشر کر کے اس کی وحدت کو بالکل مٹا ہی نہ دے۔ یہاں بہت سے لوگ مقامی زبانوں کی محبت کا واسطہ دے کر خطے کا تعصب اُبھار رہے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس کو ایک معصوم سی تحریک سمجھتے ہیں مگر ہر ذی فہم آدمی کو معلوم ہے کہ پاکستان کے بعض خطوں کی لسانی تحریک دراصل نسلی تحریک ہے اور اس کے پیچھے زبان کی ترقی کا جذبہ اتنا نہیں جتنا علاقائی ریاستوں کا وہ خواب ہے جو ہمارے ملک کے بعض کم فہم بھائیوں کے دل و دماغ میں، ان کی بدبختی کے زیر اثر سایا ہوا ہے۔ لہذا میں اپنی دانست میں علاقائی زبانوں کی تحریک کو خُبے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اکثر یہ درخواست کرتا رہتا ہوں کہ حکومت، ملک کی وحدت قومیت کی خاطر اس لسانی تعصب کو پھیلنے سے روکے اور مقامی زبانوں کی ترقی کے ہر منصوبے کے پس پردہ محرکات کا بھی جائزہ لیتی رہے۔

میں پاکستان میں علاقائیت کا اس لیے بھی مخالف ہوں کہ پاکستان کے قیام کے وقت اس علاقائیت کا کوئی سوال نہ تھا۔ پاکستان قبیلوں اور علاقوں کی اساس پر قائم نہیں ہوا ہے، وہ تو اس تاریخی حقیقت پر قائم ہوا ہے کہ مسلمانان ہندوستان کو صرف پشتون، یا پنجابی، یا سندھی، یا بنگالی، یا بلوچ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مجموعی طور پر اپنی تہذیبی وحدت، مشترکہ روایات اور دین و مذہب کو برقرار و محفوظ رکھنا ہے، اسی طرح قیام پاکستان کے وقت پنجابی، پشتو، سندھی وغیرہ کے تحفظ کا کوئی سوال نہ تھا، بلکہ سارا سوال یہ تھا کہ مشترکہ ہندوستان میں مسلمانان ہند کی تہذیبی زبان کو سخت خطرہ ہے، اس کو بچایا جائے۔

میں پاکستان کی سب اقوام کا مداح و معترف ہوں۔ اسی طرح میں پاکستان کی ہر زبان کی ترقی کا خواہاں ہوں اور ہر زبان کے فروغ کے لیے کوشاں بھی ہوں، مگر یہ سب اس شرط پر کہ ہر علاقے کی خوشحالی مجموعی قومی خوشحالی میں اور ہر خطے کی زبان ملک کی مسلمہ قومی وحدت میں کوئی خلل نہ ڈالے، بلکہ سب اپنے انفرادی رنگوں کے باوجود ملک کی وحدت کو مستحکم کرنے میں پورا پورا اشتراک کریں۔ یہ ان تاریخی حقائق کا تقاضا ہے، جن کے زیر اثر ایک الگ ملک کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ جب یہ ملک مسلمانوں کا حاصل کردہ ہے اور انہی کے نظریے کی خاطر بنا ہے تو پھر اس میں غیر مسلموں کا کیا مقام ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وطن ہونے کے لحاظ سے پاکستان مسلموں اور غیر مسلموں کا مشترک وطن ہے اور وطن کے اشتراک کا دوسرا مطلب ماسوا اس کے کچھ نہیں کہ اس میں دنیاوی لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم شہری کے حقوق مساوی ہوں گے اور مذہب کے فرق سے ان کے حقوقی شہریت، امن و آسائش اور حقوق و اختیارات میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اسلام میں یوں بھی عبادت اور مذہبی آزادی کا اصول ایک مسلم اصول ہے، لہذا غیر مسلموں کو بھی اپنے وطن کی قومیت سے گہری محبت ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

پاکستانی قومیت اور وحدت کے لیے اسلام اور ان تاریخی احساسات کو زندہ رکھنا لازم ہے جن سے یہ ملک ظہور میں آیا۔ خدا نے ہمیں جو جغرافیہ عطا فرمایا اور اس کو یکجا رکھنے کے لیے اسلامی جذبہ بہت قیمتی چیز ہے۔

مشق

- ۱۔ صحیح یا غلط پر نشان لگائیں۔
 - (ا) پاکستان کے بعض خطوں کی تحریک دراصل نسلی تحریک ہے۔ (ص/غ)
 - (ب) پاکستانی قومیت بالکل غیر واضح چیز ہے۔ (ص/غ)
 - (ج) پاکستانی قومیت کی اب پھر تعریف پوچھی جائے گی ہے۔ (ص/غ)
 - (د) مسلمان اپنی تہذیب اور زندگی کے نقطہ نظر کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ (ص/غ)
 - (ه) اقبال، عفتہ کما اور وطن کی وحدت میں گہرا عقیدہ رکھتے تھے۔ (ص/غ)
- ۲۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

تعمد و اہمیت، جنت و ناری، ستم و ظلم، غم و شہادت، تہذیب و درایت، نیک و نیک۔
- ۳۔ ڈاکٹر عبد اللہ نے پاکستانی قومیت کا جو مسئلہ بیان کیا ہے، آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں؟
- ۴۔ قومیت اور علاقہ قریب کے مابین، جو امتیاز مصنف نے واضح کیا ہے، اسے اپنے لفظوں میں لکھیں۔
- ۵۔ خالی جگہیں اصل متن کے مطابق پُر کریں۔
 - (ا) جن کے تصورات کو میں پر محمول نہیں کرتا۔
 - (ب) پاکستان کے لیے جدا قومیت کا جو اٹھایا جاتا ہے۔
 - (ج) جس کی کسی نے کرا دی تھی۔
 - (د) پاکستانی بالکل واضح چیز ہے۔
 - (ه) قوم کو ابھی خود بھی معلوم نہیں کہ ہم بھی ہیں یا نہیں۔
- ۶۔ متعلق فعل کیا ہوتا ہے؟ فعل، فاعل اور مفعول کی مناسبت سے کیسے تبدیل ہوتا ہے؟

ڈاکٹر عبادت بریلوی



وفات: ۱۹۹۸ء

پیدائش: ۱۹۲۰ء

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز اینگلو عربک کالج دہلی سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آئے اور اورینٹل کالج لاہور سے منسلک ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے شعبہ اُردو کے صدر بن گئے۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے اور اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی۔ ۱۹۸۰ء میں وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ وہ اردو کے ایک نامور محقق تھے۔ اُن کی بیشتر کتابیں ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ رہی ہیں لیکن بطور نقاد بھی اُن کی حیثیت مسلمہ ہے۔ ان کی تنقید کا انداز وضاحتی تجزیہ کا ہے۔ ایسے تجزیے میں کسی مصنف کے ابتدائی احوال سے لے کر ارتقائی مرحلے سبھی کچھ زہر بحث آجاتے ہیں۔ اُن کا تجزیہ عام طور پر ہمدردانہ ہوتا تھا۔ وہ ادبی مسائل کی پیچیدگیوں میں نہیں الجھتے، بلکہ معنوی سطح پر رہتے ہوئے ادب پارے کا تمام احوال قاری کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ وہ اپنے تجزیے کو درجہ بدرجہ قاری کے سامنے کھولتے ہوئے اسے اپنے منطقی استدلال سے قائل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاں تحقیقی اور تنقید کا رشتہ زیادہ مضبوط نظر آتا ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کے تصنیفی کارناموں اور غیر معمولی نوادر کو تلاش کیا۔ انھوں نے گلکرسٹ کی نظمیں، حیدری کی کہانیاں، ولی، میر اور مومن کے حالات زندگی تلاش کی، جو ایک گراں قدر تخلیقی کارنامہ ہے۔

تصانیف: اُردو تنقید کا ارتقاء، تنقیدی زاویے، غزل اور مرثیہ، غزل و غالب، سخن و روایت کی اہمیت، جدید شاعری، جدید اُردو ادب اور میر تقی میر وغیرہ

کچھ ادب کے بارے میں

30

صدیاں گزر گئیں، جنگ بیت گئے لیکن ازل سے ادب کا جو نوتا انسانی ذہن و دماغ، شعور و ادراک اور جذبات و احساسات سے بچو تا آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے۔ اس درمیان میں ہزار ہا انقلاب آئے، زمانے نے میسوں کو میس لیں اور دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا، لیکن کوئی تبدیلی، کوئی انقلاب، کوئی حادثہ ادب کے اس بہتے ہوئے چشمے کو خشک نہ کر سکا۔ برخلاف اس کے جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، وقت کے ساتھ ساتھ ادب کے قدم ترقی کی شاہراہوں پر برابر آگے کی طرف بڑھتے گئے۔ زمانے کی مشاطگی اس کو زیادہ سے زیادہ بناتی سنوارتی گئی۔ چنانچہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ حسین بھی ہوتا گیا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ دل موہ لینے والی کیفیت بھی پیدا ہوتی گئی۔ زمانے کے تغیرات و انقلابات اس کو ختم تو نہ کر سکے لیکن اس کے اثرات کو ہر دور کے ادب نے ضرور قبول کیا اور بڑی حد تک وہ ان ہی تبدیلیوں، ان ہی تغیرات اور ان ہی انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ادب میں ہر زمانے کی تہذیب کے اثرات کا فرما ملتے ہیں وہ بالکل ایک نگس معلوم ہوتا ہے، اس زمانے کے سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کا۔ زندگی کی ساری تصویریں اس میں چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔

لیکن آخر ادب کیوں پیدا ہوا؟ کیوں اس کا نوتا پھوٹا اور پھوٹ کر چشموں اور دوراؤں کی صورت اختیار کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ، ہر زمانے، ہر دور اور ہر ماحول میں برابر بہتا رہا؟ کیوں اس کو حوادث زمانہ کی باؤسوم خشک نہ کر سکی؟ انقلابات و تغیرات کیوں اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے؟ وہ کیوں ہر زمانے کی زندگی کو سرسبز و شادابی سے روشناس کرتا رہا اور کیوں اس نے بعض اوقات خود زمانے کی بہتی ہوئی ندی کے دھارے کے رخ کو بدل دیا؟

یہ سوالات ادب کے ہر اس طالب علم کے لیے ضروری اور اہم ہیں جو ادب کے بارے میں سوچنا سمجھنا اور اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان سوالات کو پوری طرح ذہن نشین کیے بغیر ادب کو پوری طرح سمجھا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ اس کی اہمیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ادب کے ساتھ ساتھ ہر دور میں ان سوالات پر بھی ادبیات کے طالب علم غور و خوض کرتے رہے اور انھوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف طریقوں اور مختلف زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی۔

ہاں! تو ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ادب کیوں اور کس لیے وجود میں آیا؟ ادب کی قدامت کا اندازہ تو صرف اس کی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت انسان اس دنیا میں نیا نیا آیا تھا، اُسی وقت سے اس نے ادب کی تخلیق شروع کر دی تھی۔ تخلیق کا جو ہر اور تخلیق کی خواہش انسان کے اندر بالکل فطری ہے، چنانچہ انسان نہ صرف ادب، بلکہ ہر چیز کی تخلیق میں لطف محسوس کرتا ہے۔ کسی ایسی چیز کی تخلیق، جو روزمرہ کے استعمال میں آتی ہو، جس سے انسانیت کو راحت و آرام ملتا ہو، یا پھر کسی ایسی چیز کی تخلیق جس کو صرف دیکھ کر ہی وہ لطف، لذت اور مسرت حاصل کرتا ہو۔ یہ تخلیق کی اس فطری خواہش کا نتیجہ ہے، جو انسان کے اندر قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح ادب کی تخلیق بھی ہے، جس میں انسان کی اسی فطری خواہش کو دخل ہے۔ البتہ اس کی نوعیت کسی قدر بدل جاتی ہے۔ دوسری تخلیقات کا تعلق مادیات سے ہے، لیکن ادب کی تخلیق میں مادے کو دخل نہیں۔ برخلاف اس کے اس کی نوعیت روحانی ہے۔ انسان کے جذبات و احساسات میں جو موجیں برابر اٹھتی رہتی ہیں، اُن کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا دینا ادب کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جذبات کا پتلا ہے اور ابتدائے آفرینش میں تو وہ سوائے جذبات کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اُن دنوں اُس میں عقل و شعور کے عناصر پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے۔ وہ چیزوں کے متعلق سوچ سمجھ کم سکتا تھا۔ خارجی چیزیں اور ان سے پیدا ہونے والے ذرا ذرا سے واقعات اُس کے جذبات کے ظہرے ہوئے سمندر میں ایک ایسی ہوا کا کام کرتے تھے، جس سے اس میں مد و جزر اور تلاطم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جذبات کے سمندر کی ان متلاطم موجوں کو وہ الفاظ کا روپ دے دیتا تھا، جس کو آج ہم ادب کے تحت شمار کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ دنیا میں نو وارد انسان کو اگرچہ لکھنے پڑھنے کا شعور نہیں تھا، لیکن

اس کے باوجود جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اُس کی تخلیقی کوششیں جاری تھیں۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں ادب کے نشانات ہمیں اُن گیتوں کی شکل میں ملتے ہیں جو انسان کے وقتی تاثر کے زیر اثر تخلیق کیے گئے تھے اور جن کو لوگوں نے زبانی یاد کر لیا تھا اور جب لکھنے کا شعور پیدا ہو گیا تھا تو ان کو پہلے پتوں پر اور پھر کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ یہ ادب کے ابتدائی نقوش تھے جو وقت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بنتے سنورتے رہے اور جن کے موضوعات میں اضافہ ہوتا رہا۔

سوال یہاں یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ان جذبات و احساسات کو انسان نے خود اپنے تک محدود کیوں نہیں رکھا اور عالم آخرا کر دینے کی کوشش کیوں کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں یہ خواہش بھی بالکل فطری ہے کہ جو خیالات اس کے دل میں پیدا ہوں، ان کو وہ بہتر سے بہتر طریقے سے دوسروں تک پہنچائے۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتا ہے اور اس پر جو کچھ گزرتی ہے، جو سانحات بھی اس کے دل پر اپنے نقوش چھوڑتے ہیں، حالات کی جن کروٹوں سے بھی وہ متاثر ہوتا ہے، اُن سب کو کسی نہ کسی صورت میں ساتھیوں تک پہنچا دینا، اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے، جس چیز کی بھی تخلیق کرتا ہے، اس میں پہلے تو اُس کو ذاتی طور پر سکون ملتا ہے اور دوسری طرف سماج کے دوسرے افراد اس میں دلچسپی لیتے ہیں، اگر انسان کے دل میں یہ خواہشات نہ ہوتیں، تو ادب اپنی موجودہ صورت میں ہمیں ہرگز نظر نہ آتا۔

ایک طرف تو تخلیق کی فطری خواہش اور دوسری طرف اپنے آس پاس کے افراد سے دل پر بیتی ہوئی حالت کو ظاہر کر دینے کا خیال، ان دونوں عناصر نے مل کر ادب کو پیدا کیا۔ اسی لیے ادب بہ یک وقت انسان کا ایک اضطرابی اور سماجی فعل ہوا جس میں آفاقیت کی جھلکیاں بےیرالیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بعض جگہ اس نے اپنے مخصوص ماحول اور سماج کی عکاسی ضرور کی، لیکن بڑا ادب وہی سمجھا گیا جس میں آفاقیت کے عناصر کی پوری طرح کارفرمائی تھی۔ غرض ادب پھیلا اور بڑا ہوا اور چونکہ وہ انسانوں کی اپنی چیز تھی، اس لیے انھوں نے اس سے دلچسپی لی۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف لوگوں کے ادبی مذاق میں اختلافات رہے، لیکن ادبی ذوق ان میں رہا ضرور! یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں سماج کے افراد انفرادی اور اجتماعی طور پر ادب سے دلچسپی لیتے

Not For Sale

رہے۔ ادبی ذوق اچھا یا بُرا، کم یا زیادہ ہر شخص کے دل میں رہا ضرور۔ بعضوں نے اپنے علم، شعور اور مذاق کی بلندی اور خشکی کے باعث اس میں نکھار پیدا کیا اور بعضے ان باتوں کے فقدان کے باعث ایسا نہ کر سکے لیکن ذرا گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات حقیقت نظر آنے لگتی ہے کیونکہ جس طرح انسانوں کے اندر ادب کو تخلیق کرنے کی خواہش بالکل فطری ہے، اسی طرح اس سے دلچسپی لینا بھی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ کون انسان ایسا ہو سکتا ہے جو دوسرے انسانوں کے جذبات و احساسات سے دلچسپی نہ لیتا ہو اور پھر جب اس جگ بیتی کے روپ میں اس کو آپ بیتی کی تصویریں نظر آئیں اور پھر جب ان کا پیش کرنے والا فن کار ان میں ایسے رنگ بھر دے، جو ان کو فن کاری کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے تمام تر جمالیاتی خوبیوں کا نمونہ بنا دیں۔

انسان کے اندر حُسن کا احساس سب سے زیادہ قوی ہے اور وہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس حُسن کی تلاش میں رہتا ہے اور ادب چونکہ فن کاری کے ساتھ ساتھ چند خاص خیالات اور چند خاص جذبات و احساسات کو پیش کرنے کا نام ہے، اس لیے اس میں حُسن کا پیدا ہونا لازمی ہے اور جب کسی چیز میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے تو انسان اس میں دلچسپی لیے بغیر نہیں رہ سکتا، کیونکہ وہ فطرتاً حُسن کا شیدائی ہے۔ چنانچہ ادب سے انسان کی دلچسپی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں فن کارانہ اور صانعانہ حُسن کی دنیا میں سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ اس سے دلچسپی لیتا ہے، کیونکہ اس کے وجود سے اس کے احساسِ جمال کو تسکین ہوتی ہے۔ یہ احساسِ جمال کوئی اٹل چیز نہیں، یہ بھی وقت، ماحول، حالات و واقعات، افتادِ طبع اور ذہنی رجحانات کے اختلافات کے باعث ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، لیکن احساسِ جمال کا ہونا ہر انسان کے اندر لازمی ہے۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، اچھا ہو یا بُرا۔ یہ ممکن ہے کہ ادب یا فنونِ لطیفہ کا ایک شاہکار ایک ہی وقت میں ایک ایسے انسان کی دلچسپی کا باعث بنے اور اس کے احساسِ جمال کو تسکین دے، جس کے مزاج، افتادِ طبع اور ذہنی رجحان میں اس شاہکار کی خصوصیات میں ہم آہنگی ہو اور اس وقت وہی شاہکار ایک دوسرے انسان کی، جس کے مزاج کو اس سے مناسبت نہیں، طبیعت منھض کر دے، لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی انسان کسی بھی خوبصورت چیز کو دیکھ کر متاثر نہ ہو۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اس میں تو حُسن ہوتا ہی ہے، چاہے اس کے موضوعات بہ ذاتِ خود حسین نہ ہوں، بلکہ کریہہ اور بد صورت ہوں۔

Not For Sale

یہ تو فن کار کا کمال ہے کہ وہ بد صورت سے بد صورت چیز میں بھی حسن کی رعنائی اور دل کشی پیدا کر دے۔ بہر حال ادب ایک ایسا مقام ہے، جہاں فن کار کی ساری بد صورت چیز کو بھی حسن کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے ادب کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے کیونکہ ہماری سماجی زندگی میں کوئی اور مقام ایسا نہیں آ سکتا، جہاں بد صورت چیز کو بھی حسین بنا کر پیش کیا جاسکے۔ یہ شرف صرف فنون لطیفہ اور ادب کو ہی حاصل ہے۔ پس انسانی زندگی میں اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

(تحقیقی زاویہ)

مشق

- ۱۔ متین کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔
 - (۱) انسان کے اندر حسنین کا احساس سب سے زیادہ قوی ہے۔
 - (ب) زمانے کی سسٹم اس کو زیادہ سے زیادہ بناتی سنوارتی ہے۔
 - (ج) ان جذبات و احساسات کو نے خواہے تک محدود کیوں نہیں رکھا۔
 - (د) ادب سے انسان کی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے۔
 - (۲) ادب کے قدم ترقی کی پر برابر آگے بڑھتے گئے۔
 - (ز) احساس جمال کا ہونا ہر کے اندر لازمی ہے۔
- ۲۔ عبارت پر روشنی سے اس مشن میں کتنے زاویوں سے ادب کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے؟
- ۳۔ تنقید کی تعریف کریں نیز بتائیے کہ زیر نظر مضمون ”کچھ ادب کے بارے میں“ کہاں تک اس پر پورا اترتا ہے؟
- ۴۔ ادب کی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔
- ۵۔ فعل کی فاعل سے مطابقت کے حوالے سے جملے درست کر کے لکھیں۔
- ۶۔ میری کتاب میں قلم اور کاغذ سب چیز تھیں۔

Not For Sale

۶۲۔ چار کپ، ایک گلاس اور دو پیئیں ٹوٹ گئے۔

۶۳۔ شاہ جہاں نے عمارتیں بنوائیں۔

۶۴۔ ہم نے بیاز کے پتروں کو کالے پائے۔

۶۵۔ فضول شرجی کی وجہ سے اس کا سرمایہ اور احترام ٹٹ گئے۔

۶۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل جملوں کی تشریح کریں۔

۱۔ ایک طرف تو تخلیق کی فطری خواہش اور دوسری طرف اپنے آس پاس کے افراد سے دل پر پختی ہوئی حالت کو ظاہر کر دینے کا خیال، ان دونوں عناصر نے مل کر ادب کو پیدا کیا۔

ب۔ اس اعتبار سے ادب کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے، کیوں کہ ہماری سماجی زندگی میں کوئی اور مقام ایسا نہیں آ سکتا، جہاں بد صورت چیز کو بھی حسین بنا کر پیش کیا جاسکے۔

اُردو حروف تہجی:

ا، آ، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ،

ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی، ے۔ (تعداد = ۳۷)

مُرکب حروف: وہ حروف ہیں جو ہائے دوپیشی (مخلوط) سے مل کر بنتے ہیں۔ یہ کس تعداد میں پندرہ (۱۵) ہیں۔

بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڈھ، گھ، لھ، مھ، نھ

زبان کے جدید اصولوں کے مطابق الف پہلے اور آ بعد میں آتا ہے کیونکہ الف ایک جب کہ الف + الف = آ شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہائے مخلوط (ھ) اُردو میں کبھی لفظ کے شروع میں نہیں آتا۔ ہمزہ اُردو میں پورا حرف شمار نہیں ہوتا یہ بسا اوقات بطور اضافت آتا ہے۔ مثلاً سرمایہ اُردو، مجموعہ کلام، تھہ مخلوص۔

طلبہ کو تنقید کی تعریف اور چند مشہور نقادوں کے نام بتائیں۔

Not For Sale

مشتاق احمد صدیقی



پیدائش: ۲ اگست ۱۹۶۰ء

صوبہ خیبر پختونخوا کے مردم خیز شہر ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اُردو) کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ 1987ء سے صوبے کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس میں مصروف رہے اور آج کل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر 1 ایبٹ آباد میں بحیثیت صدر شعبہ اُردو اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایم۔ فل اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے مقالہ مرزا عزیز احمد دارپوری، احوال و آثار، لکھ کر مکمل کیا جب کہ اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے ریسرچ سکالر رہے اور ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ”ممتاز شیریں کا ذہنی ارتقا“ ہے۔ ان کا طبی رجحان تحقیق اور تنقید نگاری کی طرف رہا۔ ان کی نگارشات مختلف ادبی رسائل و جرائد اور کالج میگزینز میں چھپتے رہے، ان کے اہم مطبوعہ مضامین درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ بیروڈی اور اُردو ادب
- ۲۔ تحقیق و تنقید کا رشتہ
- ۳۔ پنیاں انگارے ایک جائزہ
- ۴۔ تقویر خدا اور مفہوم دُعا
- ۵۔ صحرائیت و بدویت اقبالؒ کی نظر میں
- ۶۔ ایہام گوئی کی تحریک کے اسباب

Not For Sale

لمحے فکریہ

وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک ترقی پزیر ملک ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے لیکن روز بڑھتی ہوئی آلودگی اور آبادی نے اس کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ کسی بھی ملک یا معاشرے میں آبادی اور وسائل کے درمیان، ”خصوصاً خوراک کے وسائل“ اس دباؤ کا باعث بن جاتے ہیں جس کے نتیجے میں عموماً معیار زندگی میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کی اور دباؤ کو دور کرنے کے لیے بالآخر انگلستان کے مشہور معیشت دان تھامس مالتھس (Thomas Malthus) نے نظریہ آبادی پیش کیا جس کا تعلق آبادی میں کمی سے ہے۔

حالیہ دہائیوں کے دوران میں کئی ترقی پذیر ممالک ”جن میں بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش اور پاکستان شامل ہیں“ افراط آبادی کا شکار ہیں۔ ان ممالک میں ہر سال آبادی کے دباؤ میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ ساری دنیا کے پچاس چھوٹے ممالک کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان ممالک کی ترقی کی رفتار متاثر ہو رہی ہے۔ ان کی پیداوار، فی کس آمدنی، سرمایہ کاری اور چھتیس بھی متاثر ہوتی جا رہی ہیں۔ جس سے عوام روز افزوں مہنگائی کے مصائب میں گرفتار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

آبادی کے دباؤ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ممالک جہاں آبادی کا دباؤ کم ہے اور دوسری ان ممالک کی جہاں آبادی کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔ آبادی کے دباؤ کی یہ اقسام ہر ملک کی شرح پیدائش کو مد نظر رکھ کر متعین کی جاتی ہیں۔ جن ممالک میں آبادی کا یہ دباؤ کم ہے وہاں عموماً شادیاں زیادہ عمر میں کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے آبادی کے دباؤ میں اضافہ نہیں ہوتا لیکن جن ممالک میں شادیاں کم عمری میں کر دی جاتی ہیں وہاں آبادی کے دباؤ میں بے تحاشا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت وطن عزیز کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہے اور اس کی آبادی میں 1.73 فیصد سالانہ شرح سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو کسی بھی ممالک سے بہت زیادہ ہے۔ اگر اس میں کمی نہ کی گئی تو آئندہ 37 سالوں میں آبادی دو گنا ہو جائے گی اور یہ 2050ء تک 349 ملین تک پہنچ جائے گی۔ جبکہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی اوسط شرح آبادی 0.1

Not For Sale

فیصد ہے۔ وطن عزیز کی آبادی کا اس طرح بڑھنا اور اس کے دباؤ میں اضافہ ہونا ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے کہ جس سے آگاہی ہر ذمہ دار بشری کو فرض ہے۔ اس دباؤ کی کمی میں مٹی اور انفرادی سطح پر کوششیں وقت کی اہم ضرورت ہے۔

تخلیق آدم کے بعد نسل انسانی تیزی سے پختی شروع ہوئی اور سیکڑوں سے لاکھوں، لاکھوں سے کروڑوں اور کروڑوں سے اربوں تک جا پہنچی ہے۔ آغاز میں اس میں اضافے کی رفتار کم تھی لیکن گزشتہ دو، تین صدیوں کے دوران میں اس میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس طرح ضروریات زندگی میں بھی اضافہ ہوا اور رہائش و خوراک کے مسائل نے جنم لیا۔ بحال قدرتی وسائل پر بھی بوجھ بڑھ گیا۔ درختوں کے بے تحاشا کٹاؤ سے جنگل سکو گئے۔ قصبوں اور شہروں پر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ سے زرعی زرعی زمینوں پر مکانات، کارخانے اور فیکٹریاں بن گئیں۔ اس طرح زرعی زمین کی کمی نے وطن عزیز کو مزید وسائل کی کمی کا شکار بنا دیا ہے۔

شہری آبادیوں کا استعمال شدہ گندہ پانی، کارخانوں، فیکٹریوں اور گاڑیوں کے دھوئیں اور ہر طرف پھیل جانے والی گندگی کی بہت بکثرت نے آبی، فضائی اور زمینی آلودگی میں اضافہ کیا ہے۔ اس طرح وطن عزیز میں جہاں ہر طرف آلودگی نے ذریعے ڈالے وہاں بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ بھی ہمارے قدرتی وسائل برداشت نہ کر سکے اور ہمیں وسائل کی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی بنا پر پوری دنیا میں بڑھتی ہوئی آلودگی اور آبادی کے پیش نظر پوری دنیا کے ماحولیات معاشیات، منصوبہ ساز اور، حوالہ کا تحفظ چاہنے والے فکر مند ہیں اور وہ سب وسائل اور ضروریات میں توازن قائم کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ پوری نوع انسانی کے معیار زندگی کو بہتر کیا جاسکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی بڑھتی ہوئی آلودگی اور آبادی کے بارے میں فکر مند ہوں گے۔

وطن عزیز بھی اسی طرح کے پیچیدہ حالات سے دوچار ہے جس کے باعث ترقی کی رفتار سے سست تر ہوتی جا رہی ہے جس سے عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے میں مشکلات درپیش ہیں۔ کسی بھی ملک کے عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے خوراک، رہائش، تعلیم، طبی سہولتوں اور دیگر اشیا کا مناسب مقدار میں میسر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ہر قومی نقطہ نظر سے بہتر زندگی کے لیے قوم کے ہر فرد کو اس کی ضروریات اور سہولیات کا میسر ہونا ناگزیر ہے۔ جتنے کم افراد کو یہ سہولیات میسر ہوں گی اس قوم کا معیار زندگی اتنا ہی کم ہوگا۔ جس کا ایک بڑا سبب سرکاری اور نجی سطح پر منصوبہ بندی کا فقدان

Not For Sale

ہے۔ اگر زندگی کے ہر شعبے میں سرکاری اور نجی سطح پر منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو ان درپیش مسائل میں خاطر خواہ کمی کی جاسکتی ہے، عوام کے معیار زندگی کو بلند کیا جاسکتا ہے اور وطن عزیز کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جاسکتا ہے۔

نچوئے خوں ہے لہر میں، پر کوئی شیریں نہیں
ہر کوئی فرہاد ہے، مفلسی کے دہر میں

① (معیار زندگی کا تعلق مادی اشیا اور سہولیات کے حصول کے ساتھ ساتھ اس کے سماجی ماحول اور ذہنی کیفیت سے بھی ہے۔ مثلاً تعلیم اور اس کی شرح خواندگی، صحت اور حفظان صحت کے اصولوں پر عمل، جمہوری اقدار، آزادی اظہار، سماج میں خواتین کا مقام، ترقی کے یکساں مواقع، قانون کی پاسداری اور کتب بینی کی شرح، معیار زندگی کو بہتر بنانے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں) ①

بہتر معیار زندگی ہر فرد کا بنیادی حق ہے لیکن آبادی اور وسائل میں عدم توازن اس حق کو متاثر کرتا ہے۔ اس سے محبت، احترام، دردمندی اور رواداری کی جگہ خود غرضی، انتہری، بے اطمینانی اور انتشار پھیلتا ہے۔ جرائم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور سماجی عدم توازن جنم لیتا ہے جس سے سماجی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ بے روزگاری کی شرح میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔

ضرورت اس امر ہے کہ انسان خود اعتمادی اور خود اعتمادی سے کام لے اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کرے تاکہ سرمایہ کاری کی راہیں ہموار ہوں۔ عوام کے روزگار اور آمدن میں اضافہ ہو اور غربت و افلاس میں کمی واقع ہو۔ ہمارا سماجی نظام، تاریخی، جغرافیائی اور نظریاتی عوامل کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔ جس میں ہماری مذہبی اقدار سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دنیا و آخرت پر ایمان، صداقت، بزرگوں کا احترام، والدین، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق، ازدواجی زندگی میں وفاداری، سماجی انصاف، ایسی اسلامی اقدار ہیں کہ جن پر چل کر ہم اپنے بہت سے سماجی مسائل میں حوصلہ افزا کی لاسکتے ہیں۔

(ماخوذ از ماڈیول تعلیم و ترقی آبادیات پراجیکٹ، شعبہ نصاب، وزارت تعلیم، حکومت پاکستان)



رتن ناتھ سرشار

وفات: ۱۸۹۵ء

پیدائش: ۱۸۳۶ء

پندت رتن ناتھ سرشار کا شمار اردو ادب کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ تخلیق نگاری کا شوق انھیں اخبارات اور رسائل کی طرف کھینچ لایا، وہ مختلف رسالوں اور اخبارات کے مدیر رہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی دعوت پر حیدر آباد چلے گئے اور ”دبدبہ آصفی“ کے ایڈیٹر بن گئے۔ اُن کا انتقال ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد میں ہوا۔

اردو ناول کے ارتقا اور فروغ میں سرشار کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اُن کی تخلیقات فسانہ آزاد، جام سرشار، اور سیر کھسار نے ایسی شہرت پائی کہ بہت سے نامی گرامی مصنفین اور مصلحین قوم ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کا ابتدائی ناول ”فسانہ آزاد“، اخبار اودھ میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ ان کے ناولوں میں سیر سپاٹے، ہنسی مذاق اور عجیب وغریب کمالات موجود ہیں۔ ان کا قلم رواں دواں تھا اور انداز اتنا پختہ تھا کہ محیر العقول واقعات پر بھی حقیقت کا گماں ہوتا تھا۔

دراصل اُن کا نظریہ تھا کہ ناول محض حظ اٹھانے اور وقت گزاری کا وسیلہ ہے۔ اُن کے ناولوں میں بالواسطہ مقصدیت اور اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی نثر کو آرائش سے محفوظ رکھا ہے۔ تاہم محاورات، روزمرہ اور تمثیل و تشبیہ کی معاونت سے اس کا رشتہ قدیم طرز تحریر سے مجتہد نظر آتا ہے۔

تصانیف: شمس الضحیٰ، اعمال نامہ روس، کاشی، الف لیلا اور جُدائی نو جدار وغیرہ۔

مشق

- ۱۔ متن کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔
 ۱۔ وطن عزیز ایک _____ تشریحی پیرائیس۔ ملک ہے۔
 ۲۔ تخلیق آدم کے بعد نسل انسانی _____ سے پھیلی شروع ہوئی۔
 ۳۔ درختوں کے بے تحاشا _____ کٹاؤں سے جنگل سکون گئے۔
 ۴۔ تاکہ پوری _____ انسان کے معیار زندگی کو بہتر کیا جاسکے۔
 ۵۔ وطن عزیز بھی اسی طرح کے _____ حالات سے دوچار ہے۔
 ۶۔ بہتر معیار زندگی ہر فرد کا _____ بننا ہی _____ حق ہے۔
 جس میں ہماری _____ اقدار سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔
- ۲۔ معیار زندگی سے کیا مراد ہے؟ اس کو کس طرح بلند کیا جاسکتا ہے؟
- ۳۔ اگر وطن عزیز کی آبادی و مسائل کے مطابق ہو تو وطن میں کیا متوقع تبدیلیاں رونما ہوں گی؟
- ۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔
 ۱۔ پادشہ۔ منسوب۔ بدعتی۔ خود اختیاری۔ انتشار۔ پاسداری۔
- ۵۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر درست تلفظ کے ساتھ لکھیں۔
 آتشیں۔ معیہ۔ امر۔ آخرت۔ توازن۔
- ۶۔ اپنے شہر کے میونسپلی کے ایڈمنسٹریٹر کو، لکھیں اور شاپنگ بیگ کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں تلف کرنے کی تجاویز دیں۔

ہدایت برائے اساتذہ: طلبہ کے مابین ماحول کی آلودگی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل پر مکالمے کروائیں۔

داروغہ جی کی پانچوں گلی میں اور سرکڑا ہی میں

(اس متن کی عبارت رتن ناتھ سرشار کے ناول ”فسانہ آزاد“ سے انتخاب ہے۔ ”فسانہ آزاد میں فی لحاظ سے ناول کے ضد و خال متے ہیں۔ اس کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔ اس ناول میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ لکھنؤ کی معاشرت کو ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے جس سے قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ والیان اودھ کی شاہ خرچیاں، مالی معاملات اور کاروبار سلطنت سے غفلت کی کچی اور کھری تصویر پیش کی گئی ہے۔ اودھ کے نوابین کی غفلت اور عیش کوئی کا یہ عالم تھا کہ ان کے معمولی ملازمین روزمرہ اخراجات کی مد میں ان سے ہزاروں روپے بٹور رہے تھے۔ چاہے وہ داروغہ جی ہوں، بزاز یا پھر خوجی۔ سرشار نے لکھنؤ کی تہذیبی، سیاسی اور اخلاقی شکست و ریخت کو بڑی باریکی اور تفصیل کے ساتھ ”فسانہ آزاد“ کا حصہ بنایا ہے۔ زیر نظر اقتباس میں بھی لکھنؤ کے عہد میں نوابان کے طرز زندگی، میاں آزاد اور خوجی کے رد عمل کو پیش کیا گیا ہے۔)

داروغہ جی! اس حلوائی کا حساب کرو اور اس کو سمجھا دو کہ اگر خراب یا سڑی ہوئی باسی مٹھائی بھیجی تو اس سرکار سے نکال دیا جائے گا۔ پرسوں برنی خراب بھیجی تھی گھر میں شکایت کرتی تھیں۔

سنئے ہو جی شیوہ رین! دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں؟ خبردار! جو گلی سڑی مٹھائی بھیجی تو تم جانو گے۔ اب تم نے نمک حرامی پر کمر باندھی ہے، کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے۔ ہاں! بس کہہ دیا ہے تم سے۔ تمہارے بھائی بند سیکڑوں در چوم کے مٹھائی دیں گے مگر تم راندے ہی جاؤ گے۔

نہیں کھداوند! گلام کی کیا مجال۔ اول بال دوں اول مال، چاشنی جرا (ذرا) بہت آگئی تو داند کم

پڑا۔ ملائم نہ رہی، کڑی ہو گئی۔ چاشنی کی گولی دیر میں دیکھی۔ نہیں تو یہی دکان کی برنی تو شہر بھر میں ماشور (مشہور) ہے۔ وہ لُجّت (لڈت) ہوتی ہے کہ ہونٹ بندھنے لگتے ہیں۔

داروغہ: چلو تمہارا حساب کر دیں، لے بتاؤ۔ کتنے دن سے خرچ نہیں پایا اور تمہارا کیا آتا ہے؟
حلوائی: جو حساب سے ہو۔

داروغہ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ* اور ہم پوچھتے کیا ہیں۔ یہی تو پوچھتے ہیں کہ حساب سے کیا ہوا؟
حلوائی: اگلے مہینے میں پچیس روپے کچھ آنے کی آئی تھی اور اب کی دس تارکھ (تاریخ) انگریزی (انگریزی) تک کوئی ستر یا سی۔

داروغہ: اجی! تم تو گئے گدے بازیاں کرتے ہو۔ ستر یا سی یا سو۔ اس مہینے میں اتنی۔ اس مہینے میں اتنی۔ یہ بکھیرا تم سے پوچھتا کون ہے؟ اس جھنجھٹ سے ہمیں واسطہ کیا بھلا، ہمیں تو بس گٹھڑی بتا دو کہ اتنا ہوا۔

حلوائی: اچھا حساب تو کر لوں (تھوڑی دیر کے بعد) بس ایک سو بیالیس روپے اور دس آنے دیجیے۔ چاہے حساب کر لیجیے، بولتا جاؤں؟

داروغہ: اجی! تم کوئی نئے تو ہو نہیں۔ اب بتاؤ! اس میں یاروں کا کتنا ہے۔ سچ بولنا لالہ! (پیٹھ ٹھوک کر) آؤ وارے نیارے ہوں۔ کیوں ہے نہ؟

حلوائی: بس سوہم کا دے دیو۔ بیالیس تم لے لو۔ سیدھا سیدھا میں تو یہ جانتا ہوں۔

داروغہ: اچھا منظور، مگر بیالیس کے باون کرو۔ ایک سو تم لو باون ہمارے۔ سچ کہنا کوئی چالیس کی مٹھائی اُس مہینے اور اس مہینے میں ملا کر آئی ہوگی یا کم؟

حلوائی: اجی بجور! آپ کو اس بھید سے کیا واسطہ! آپ کو آم کھانے سے گُرج (غرض) ہے یا پیڑ گننے سے اور سچ سچ یہ ہے کہ کوئی سب ملا کر اڑتیس روپے کی آئی ہوگی۔ مل وِخَن (وزن) میں البتہ کتر بیونبت کر دیتا ہوں، سیر بھر لڈو مانگ بھیجے۔ ہم نے پاؤ سیر کم کر دیے۔

داروغہ: ادھ! اس کی نہ کہیے۔ یہاں اندھیر گہری چو پٹ راجہ ہے۔ یہ دماغ کسے کہ تو لے بیٹھے۔ میاں لکھ لٹ، بیوی ان سے بڑھ کر۔ ڈنڈی ترازو کون لے بیٹھے۔ چین کرو۔ دس کے پچاس لو اور سیر کے تین پاؤ بیچو۔ مزے ہیں۔ اچھا! یہ سو روپے گن لو اور ایک سو باون کی رسید ہمیں دو۔

حلوائی: یہ مول تول ہے۔ سوار پانچ ہم لیں اور باکی (باقی) ہجور کو مہارک (مہارک) رہیں۔ ماٹے (مہارک) کی بات ہے۔

الغرض داروغہ نے حلوائی کو راضی کر لیا۔ اس داروغہ کی صدقے اڑتیس روپے کے ایک سو باون دلوائے اور بیالیس سے زیادہ ہی زیادہ خود ہضم کیے۔ اے پھٹکارا! کورنگ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جن رو سا کے یہاں ایسے ایسے داروغہ اور لہکار ہوں، ان کا خدا ہی حافظ ہے، مگر نواب صاحب کے کان پر جوں تک نہ رہتی۔ وہ خبر ہی نہ ہوئے کہ کیا دیوار کیا لیا اور یار لوگوں نے حلوائی سے بالائی رقم اڑائی لی پھر وہ تو شیر مادر ہے۔

اب سینے کہ میاں خوبی نے وہ ساری گفتگوں کی جو داروغہ کی اور حلوائی میں ہوئی۔ جب داروغہ جی نے شیودین حلوائی کو خوشی رخصت کیا تو خوبی نے بڑھ کر یوں کہا:

خوبی: اتنی حسرت! آداب عرض ہے۔ کہیے! اس میں کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟ یا باون کے باون خود ہی ہضم کر چاڑھے اور؟ کار تک نہ لو گے؟ اب ہمارا اور آپ کا سا جھانہ ہوگا تو بڑی ٹھہرے گی۔

داروغہ: کیا! کس سے کہتے ہو؟ یہ ساجھا کیسا؟ آخر ہم بھی تو سنیں۔ بھگ تو نہیں پی گئے ہو کہیں؟ یہ کیا دہائی تباہی بک رہے ہو؟ ذرا سمجھ بوجھ کر بات زبان سے نکالا کیجیے۔ یہاں بیہودہ بکنے والوں کی زبان دست پناہ سے نکال لی جاتی ہے تم نکو گدوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟

خوبی: (کمر کسر کر) او گیدی! قسم خدا کی اتنی قریاں بھوگی ہوں کہ یاد کرے۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھ ہو۔ میں آدمی کوم کے دم میں سیدھا بتا دیتا ہوں۔ ذری کسی اور بھروسے نہ بھولیے گا۔ کیا خوب! اڑتیس کے ڈیڑھ سو دلوائے اور پچاس خود اڑائے اور اوپر سے غراتا ہے مردک۔ بہت داروغہ کی بھروسے نہ بھولیے گا۔ میں ابھی تو نواب صاحب سے سارا کچا چھٹا جڑتا ہوں، کھڑے کھڑے نہ

نکال دیے جاؤ تو سہی۔ ہم تمام عمر ریسوں ہی کی صحبت میں رہے ہیں، گھانس نہیں چھیلا کیے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے بیس روپے ادھر رکھ دیجیے اور بیسیوں چہرہ شاہی ہوں۔ بس اسی میں خیر ہے، ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔ اب سوچتے کیا ہو؟ ذرا چین چڑ کرو، تو ابھی ابھی قلعی کھول دوں۔ یہ اکڑنا وکڑنا سب بھول جائے اور یوں تو بیس پر معاملہ ہوتا ہے۔ بولو۔ اب کیا رائے ہے؟ بیس روپے سے غم کھاؤ گے یا ذلت اٹھاؤ گے۔ پہلے تو بڑے گرم ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کھائی جاؤ گے، مگر اب موم ہو گئے۔ لے بس اب لائیے لائیے بیس چہرہ شاہی سامنے بسا دیجیے، ورنہ خیر نہیں نظر آتی۔ ابھی تو کوئی کانوں کان نہ سنے گا، پیچھے البتہ بڑی میڑھی کھیر ہے۔

داروغہ: واہ ری پھوٹی قسمت! آج صبح صبح بوٹی تو اچھی ہوئی تھی۔ اچھے کام نہ دیکھ کر اٹھے تھے، مگر حضرت نے اپنی منحوس صورت دکھائی۔ خدا جانے یہ ذات شریف کہاں سے سن رہے تھے۔ لاجول ولا قوۃ! واہ رے! ہم اور واہ ری ہماری قسمت! کہیے اب باون میں سے آپ کو بیس ایک رقم کی رقم نکال دیں، تو ہمارے پاس کیا خاک رہے اور ہاں! خوب یاد آیا۔ بس باون کس مردود کو ملے۔ کل سینتالیس ہی تو ہمارے بٹے چڑھے۔ دس تم بھی لو بھئی! (ٹھوڑی میں ہاتھ دال کر) مان جاؤ استاد۔ ہمیں ضرورت تھی۔ اس سے کہا: ورنہ کیا بات تھی اور پھر ہم تم زندہ ہیں، تو سیکڑوں لوٹیں گے۔ میاں! یہ ہاتھ دونوں لٹے اور رقم ہی پیرنے کے لیے ہیں یا کچھ اور۔

خوبی: دس میں تو ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ اچھا بھئی! پندرہ دو۔

الغرض داروغہ نے مجبور ہو کر پندرہ روپے میاں خوبی کی نذر کیے اور دونوں آدمی جا کر شریک محفل ہوئے تو وہاں نواب صاحب کے فرشتے کو بھی خبر نہیں کہ یہاں کیا دارے نیارے ہوئے۔ وہاں شعر خوانی ہو رہی تھی۔

اتنے میں ایک بزاز آیا اور چوب دار نے آن کر کہا کہ: خداوند! چھاؤنی کا بزاز آیا ہے جو ولایتی کپڑا بیچتا ہے۔ کل بھی حاضر ہوا تھا مگر اس وقت موقع نہ تھا، میں نے عرض نہ کیا۔

نواب: داروغہ سے کہو۔ مجھ سے کیا گھڑی گھڑی آکے پرچہ جڑتے ہو۔ (داروغہ سے) جاؤ بھی! ان کو بھی لگے ہاتھوں بھگتا ہی دو، جھنجھٹ کیوں باقی رہ جائے۔ کچھ اور پکڑا آیا ہے ولایت سے؟ آیا ہے تو دکھاؤ، مگر بابا مول کی سند نہیں۔

بزاز: اب کوئی دوج تک سب پکڑا آجائے گا اور جو ایسی بات کہتے ہیں۔ بھلا! اس ڈیوڑھی پر ہم نے کبھی بھی مول تول کی بات کی ہے۔ آج تک! اور یوں تو آپ امیر ہیں جو چاہیں کہیں، مالک ہیں ہمارے۔

داروغہ: چلو بھی! حساب ہو جائے۔ انھو!

داروغہ اور بزاز چلے۔ جب داروغہ صاحب کی کچہریل میں دونوں کے دونوں جا کر بیٹھے تو میاں خوبی بھی ریگتے ہوئے چلے اور دن سے موجود۔ داروغہ نے جو اُن کو دیکھا تو کانٹو بدن میں ابھوئیں۔ مردنی سی چہرے پر چھا گئی۔ چپ! ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ سمجھے کہ یہ خوبہ ایک ہی کائیاں ہے؛ دنیا بھر کا نیار یا ہے اس سے خدا پناہ میں رکھے۔ صبح کو تو مردود نے بتے ہی پر نوک دیا اور پندرہ پٹیلے۔ اب جو دیکھا کہ بزاز آیا تو پھر موجود۔ آج رات کو اس کی ٹانگ نہ توڑی ہو سکی، پھر تو جاتو۔ چچا ہی بنا کر چھوڑوں، تو سہی، مگر پھر سوچے کہ:

گز سے جو مرے تو زہر کیوں دو

آؤ اس وقت جنیں وچناں کریں، پھر سمجھا جائے گا۔

خوبی: داروغہ صاحب! سلام۔

داروغہ: آؤ بھائی جان! دھر مونڈھے پر بٹھو، اچھی طرح بھی! احتیلاً و آپ کے لیے۔

بزاز صدر بازار کار بننے والا۔ ایک ہی استاد۔ تازہ گیا کہ اس کے بیٹھے سے میرا اور داروغہ کا مطلب خط ہو جائے گا۔ کسی تدبیر سے اس کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔ پہلے تو کچھ دیر داروغہ سے اشاروں ہی اشاروں میں گفتگو ہوا کی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بزاز نے کہا کہ: میاں صاحب! آپ کو یہاں کچھ کام ہے؟

خوبی: تم اپنی کہو لا۔ جی! ہم سے کیا واسطہ؟

بزاز: تم یہاں سے اٹھ جاؤ۔ چلو۔ اٹھتے ہو کہ میں دوں ایک لات اوپر سے۔

خوبی: او گیدی! زبان سنہال۔ نہیں تو اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ خون خرابہ ہو جائے گا۔

بزاز: انھوں پھر میں؟

خوبی: اٹھ کے تماشا بھی دیکھ لو۔

بزاز: بیدھا ہے کیا؟

خوبی: واللہ جو بے تے کیا، تو اتنی قرولیاں۔

قرولیاں کہہ کر خوبی کچھ اور کہنے ہی کو تھے کہ بزاز نے بیٹھے بیٹھے منہ دبا دیا اور ایک چپت جمائی۔ چلے دونوں گٹھ گئے۔ اب داروغہ کی سینے کے بیچ بچاؤ کس مزے سے کرتے ہیں کہ خوبی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کمر دبائے ہوئے ہیں اور بزاز اوپر سے ان کو ٹھونک رہا ہے اور داروغہ صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر ٹگل چچائے جاتے ہیں کہ میاں! کیوں لڑتے مرتے ہو بھی! دھول دھپے کی سند نہیں، زبانی ہی داخلہ رہے۔ خوبی اپنے دل میں جھلا رہے ہیں کہ اچھے میر فیصلہ بنے۔ اتنے میں کسی نے نواب صاحب سے جا کر کہہ دیا کہ میاں خوبی اور داروغہ صاحب اور بزاز تینوں گتے پڑے ہیں تو ایک مصاحب بولے کہ بھی! واللہ اچھی گلڈم ہے۔

اتنے میں بزاز دوڑا ہوا آیا اور نواب صاحب سے فریاد کی کہ بجور (حضور) ہم آپ کے ہاں تو سستا مال دیتے ہیں، مگر یہ کھوجی (خوبی) حساب کتاب کے دکھت (وقت) نہ ملے، لاکھ لاکھ کہا: کہ بھی! ہم اپنے مال کا بھاؤ تمھارے سامنے نہ بتائیں گے، مل انھوں نے ہاری مانی نہ جیتی اور لٹے پنچے جھاڑ کے چپٹ کی ٹھہرائی۔ کجور (کنزور) مار کھانے کی نشانی میں نے وہ گد ادا کیا کہ چھٹی کا دودھ یاد کرتے ہوں گے۔ داروغہ بھی روتے پٹیتے آئے کہ دہائی ہے۔ چار پائی کی پٹی توڑ ڈالی، خاصداں توڑ ڈالا اور سینکڑوں ہی صلواتیں سنائیں۔

میاں خوبی ایسے دھیپائے گئے اور اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس کچھ پوچھیے نہیں۔ داروغہ نے تو حضرت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بزاز نے تان تان کر لپڑ لگانے شروع کیے۔ خوبی نے دونوں کو گیدی اور مردک خربنایا اور بہت کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ لانا میری قرولی، مگر ایک نے بھی شنوائی نہ کی۔ نواب صاحب کو جو خدام

بادوب نے خبر کی تو بڑا زور دیا اور معاً یہ فخرہ چست کیا کہ حضور! میں تو حساب کرنے آیا تھا مگر جس قیمت پر اس سرکار میں کپڑا فروخت کرتا ہوں اس قیمت پر کسی اور کے ہاتھ تھوڑا ہی بیچتا ہوں۔ خوبی وہاں داروغہ جی کے پاس ڈٹے بیٹھے تھے۔ میں سوچا کہ سب تم کے کپڑوں کی قیمت سے واقف ہو جائیں گے اور صورت سے آدمی کھوٹے معلوم ہوتے ہیں، ان سے ڈرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ: خوبی صاحب! آپ ذرا اس وقت باغ میں ٹہیلے تو ہم حساب کر لیں۔ بس اس پر آنکھیں نیلی پیلی کر کے لام کاف بکنے لگے۔ نواب کے دل میں یہ بات کھب گئی۔ خوبی اور داروغہ اور بڑا زیتوں کو بلوایا اور اظہار لینے شروع کیے۔

نواب: داروغہ صاحب! یہ کیا جھڑا تھا؟ بھئی! تم تو بیٹھے بیٹھے خوب سینڑھے لڑا دیتے ہو۔

داروغہ: حضور! یہ خوبی صاحب تو بڑے ہی تیکھے آدمی ہیں۔ بات بات پر قرولی بھونکتے ہیں اور گیدی تو تکیہ کلام ہے۔ حضرت! تاکے باشند۔ یہ بے گیدی بنائے نہ چھوڑیں گے۔ اس وقت لالہ بلد یوہی سے بھڑ پڑے۔ اب میں لاکھ ہاں ہاں کرتا ہوں۔ سمجھاتا ہوں وہ باری مانتے ہیں، نہ جیتی۔ وہ تو یہ کہیے میں نے بچا کر دیا اور نہ ایک آدھ کا سر ہی پھوٹ جاتا۔

بڑا زور: بڑے بھلے آدمی ہیں، وہ تو دروگا (داروغہ) بھڑ (بیچارے) نہ آجائیں تو کپڑے و پڑے پھاڑ ڈالیں۔

خوبی: تو اب روتے کاے کو، جو ہوا سو ہوا۔ آئی گئی بات ہوگئی۔ اب یہ دکھڑا لے کے کیا بیٹھے ہو۔

نواب: لپاؤ گی تو نہیں ہوئی؟

خوبی: نہیں حضور! شریفوں میں کہیں ہاتھ پائی ہوتی ہے۔ بھلا! ہم نے ان کو لاکارا۔ انھوں نے ہم کو ڈانٹا مگر کندے تول تول کے دونوں رہ گئے۔ بھلے مانس پر ہاتھ اٹھانا کچھ دل لگی ہے اور پھر شریف کہیں پٹ کے آتے ہیں۔

نواب: تم میری شرفی نواب کی محفل میں جا کر بیٹھے اور ادھر لالہ بلد یوہی اور داروغہ صاحب گئے کہ حساب

داروغہ: ہاں بھئی! لالہ بتاؤ۔

لالہ: اجی بتائیں کیا جو چاہو، دلوادو۔

داروغہ: پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا آتا کیا ہے؟ سو دو سو۔ دس بیس پچاس جو ہو کہہ دو۔

لالہ: دروگا جی! آج کل کپڑا بڑا مہنگا ہے۔

داروغہ: لالہ! تم نے گاد دی ہی رہے۔ اجی! ہم کو گراں اور ارزاں سے کیا واسطہ۔ ہم کو اپنے حق سے مطلب ہے۔ تم تو اس طرح کہتے ہو جیسے ہماری گرہ سے جاتا ہے۔

لالہ: پھر اب کی سات سوتر پن روپے نکالے۔

داروغہ: سات سوتر پن۔ بس! ارے میاں! اب کے اتنے دنوں میں بس سات ساڑھے سات سوہی کی نوبت آئی؟

لالہ: جی ہاں! اجی آپ سے تو کچھ پردہ ہی نہیں۔ دو سو اور چھ بیس روپے کا کپڑا آیا ہے۔ اندر باہر سب ملا کے، مگر پرسوں تو نواب صاحب کہنے لگے کہ اب کے تو تمہارا کوئی پانچ پیچھے سو کا مال آیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ: ایسے مو کے (موقع) پر چونکا گدھا پن ہے۔ وہ تو پانچ سو بتاتے تھے۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ حساب کیسے سے معلوم ہو۔ کل کوئی سات آٹھ سو کا آیا ہوگا۔ تو اب سات سوتر پن ہی رکھیے۔ اس میں ہمارا آپ کا کھوتہ ہو جائے گا۔

داروغہ: اجی! کھوتہ کیسا۔ ہم تم کچھ دو تو ہیں نہیں اور ہمارے تمہارے تو باپ دادا کے وقت کے مراسم ہیں۔ تم تو مثل اپنے عزیزوں کے ہو۔ لے بولو۔ کتنے پر فیصلہ ہوتا ہے، بتاؤ۔

لالہ: بس دو سو چھ پن تو ہم کو ایک دیجیے اور تین سو اور دیجیے۔ اس کے بعد جو بڑھے وہ آپ کا۔

داروغہ: ٹھہرو میں حساب تو لگا لوں۔ دو اور تین پانچ ہوئے تو پانچ سو چھ پن تو تم لو۔ اور وہاں بچا کیا۔ سات سوتر پن میں سے پانچ سو چھ بیس گئے تو کتنے بچے؟

لالہ: دو سو ستائیں۔

داروغہ: (تہقید لگا کر) اچھا! ابھی منظور! ہاتھ پر ہاتھ مارو۔

لالہ: پھر دلو ایسے تو چلیں۔

داروغہ: ابھی لو۔ گھبراتے کیوں ہو؟

داروغہ نے پانچ سو چھپیس روپے بزاز کے حوالے کیے اور دو سو ستائیس ٹلوہ اڑائے۔ بزاز جانے لگا تھا کہ داروغہ نے پھر پکارا۔

داروغہ: ابھی! سنئے ہو۔ سات سو تیرپن روپے چھ آنے لکھے لو، تاکہ معلوم ہو کہ آنے پائی سے حساب لیس ہے۔ لالہ (مسکرا کر) بڑے کانیاں ہو دروگاہی! اجی! دو سو ستائیس روپے تھے آنہ گل آپ کا۔

آواز: "بلکہ آپ کے باپ کا۔"

جیسے ہی داروغہ اور لالہ میں باہم گفتگو ہو چکی ویسے ہی ایک موکھے میں سے آواز آئی۔ لالہ نے کہا: گل آپ کا اور آواز آئی کہ: "بلکہ آپ کے باپ کا۔" تب تو دونوں چوکنے ہوئے کہ ابھی! یہ کون بولا؟ ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ کوئی نظری نہیں آتا۔ سخت حیرت ہے کہ یا الٹی! یہ کون بولا؟ داروغہ کے حواس غائب۔ بزاز کے بدن میں خون کا نام نہیں کہ اتنے میں پھر آواز آئی: "کہو! کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟" تب تو دونوں کے رہے سہے ہوش اور بھی اڑ گئے کہ یہ اسرار کیا ہے؟

اب سنئے کہ جب خوشی نواب نامدار کی بزم عشرت بار میں بیٹھے تو داروغہ اور بزاز دونوں کو ڈھارس ہوئی کہ اب یہ بلائی اور پھر وہ سوچے کہ پٹ پٹا کر اب کس منہ سے میاں خوشی یہاں آئیں گے، لیکن خوشی ایک ہی بے حیا۔ راستے بھر یہی خیال تھا کہ وہ لوگ مطمئن ہو کر وارے نیارے کر رہے ہوں گے تو چپکے سے کسی بہانے اٹھے اور اٹھ کر کچریل کے پچھواڑے ایک موکھے کی راہ سے سب سنا کیے۔ جب گل کارروائی ختم ہو گئی، تو فرمایا کہ: (بلکہ آپ کے باپ کا) خیر۔ داروغہ اور لالہ بلدیو نے ان کو ڈھونڈ نکالا اور لالو پتہ کرنے لگے۔

بزاز: ہمارا کسور (قصور) ما پیہ (مخاف) کیجیے۔

داروغہ: اجی! یہ ایسے آدمی نہیں۔ یہ بے چارے کسی سے لڑنے بھڑنے والے نہیں۔ اپنے کام سے کام

ہے۔ باقی لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ دل میں کدورت آئی اور صاف ہو گئے۔

خوشی: یہ باتیں تو عمر بھر ہوا کریں گی۔ مطلب کی بات فرمائیے۔

داروغہ: جوار شاد ہو۔

خوشی: لاؤ پھر کچھ ادھر بھی۔

داروغہ: جو کہو۔

خوشی: سود لو! ایسے۔ پورے ایک سو لیے بغیر نہ ٹلوں گا۔ آج تم دونوں نے مل کر خوب ہماری مرمت کی ہے اور ہمارے پاس اتفاق سے قرولی نہ تھی۔

داروغہ: یہ تیس روپے تو ایک لیجیے اور یہ دس کا نوٹ بس۔ اور جو لسیٹھ کیجیے تو اس سے بھی ہاتھ دھوئیے۔

خوشی: اجی! ازخس موئے بس ست۔ لائیے چالیس کیا کم ہیں۔

بزاز: کھاسی رقم کی رقم ہے (خاصی رقم کی رقم ہے)

خوشی: تمھاری بھی پانچوں گئی میں ہیں اور سرکڑا ہی میں ہے۔

داروغہ: (اپنے دل میں) اچھے ملے۔ ہم سمجھتے تھے کہ بس ہم ہی ہم ہیں مگر یہ ہمارے بھی گرو پیدا ہوئے۔

جب دیکھو سناجھے کو مستعد۔ اچھا پیٹا مارا مگر اب ان کے دن بھی پورے ہو گئے۔

(فسانہ آزاد)

مشق

۱۔ برزاق، داروغہ اور میاں خوجی کے درمیان ہونے والے معاملے کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ داروغہ اور حلوئی میں کیا معاملہ طے پایا؟

۳۔ اس اقتباس کی روشنی میں داروغہ کے کردار پر ایک پیرا گراف لکھیے۔

۴۔ درج ذیل محاورات اور ضرب الامثال کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ ان کا مطلب واضح ہو جائے۔

پہلے گھر میں آگ لگی تھی۔ پھر گھر میں آگ لگی۔ پھر گھر میں آگ لگی۔ پھر گھر میں آگ لگی۔

۵۔

۵۔ اس عبارت کی روشنی میں بتائیے کہ اس وقت لکھنؤ کے نوابوں کے کیا رنگ ڈھنگ تھے۔

۶۔ کسی پیشے یا جتنے کے لوگ تبادلہ خیال کے لیے الفاظ کو وضع کی بجائے کچھ اور مخصوص معانی کے لیے استعمال کرتے

ہیں۔ ایسے الفاظ کو سلینگ کہا جاتا ہے جیسے سیاسی وفاداری بدلنے والے شخص کو ”لوٹا“ کہنا۔

آپ ایسے ہی کوئی سے پانچ سلینگ تلاش کر کے نئے معانی کی وضاحت کے ساتھ لکھیں۔ نیز درج ذیل سلینگ

۷۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔

۸۔ آپ کو اس ناول کا کون سا کردار اچھا لگا اور کیوں؟

۹۔ اس ناول پر زبان و بیان کے حوالے سے تبصرہ کریں۔

براہ راست برائے اساتذہ طلبہ کو کردار نگاری کی تعریف اور کرداروں کی اقسام سے متعارف کروائیں۔

Not For Sale

خدیجہ مستور



وفات: ۱۹۸۲ء

پیدائش: ۱۲ دسمبر ۱۹۲۷ء

خدیجہ مستور بریلی کے ایک پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ انور جہان خود ایک اچھی شاعرہ اور مضمون نویس تھیں۔ اس طرح دونوں بہنوں خدیجہ مستور اور حاجرہ مسرور کو علمی و ادبی ماحول ملا۔ خدیجہ کی ابتدائی زندگی سخت مشکلات میں گزری۔ انھوں نے ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں افسانہ نگاری سے کی، لیکن ان کی اصل شہرت آدم جی انعام یافتہ ناول ”آنگن“ کی وجہ سے ہے۔ اس ناول میں انھوں نے سماجی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ایک پورے عہد کی آویزش اور کشش کا بڑی کامیابی اور خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کا قیام پاکستان کے پس منظر میں (بے شمار ناول اور افسانے لکھے۔ چکے ہیں) لیکن آنگن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ایک متوسط مسلمان خاندان کی سماجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کا کیونس اور پلاٹ بہت مختصر ہے، لیکن اس کے باوجود یہ ناول اس عہد کی سماجی اور معاشی ناہمواری کی ایک مکمل اور گچی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ ایک عام گھرانے کی کہانی ہے۔ جو سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کی گئی ہے۔ خدیجہ نے اپنی کہانیوں میں زیادہ تر عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ جو عورتوں کو ایک خاص جبر کے تحت رکھتا ہے۔ ان کا انداز تحریر بہت سادہ اور دلکش ہے۔

اصناف: آنگن، زمین، بوچھاڑ، چند روز اور، تھکے ہارے، شہناہیٹھا پانی وغیرہ

Not For Sale

آنگن

(خدیجہ مستور کا ناول ”آنگن“ ایک کرداری ناول ہے۔ یہ ناول تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک کے زمانے پر محیط ہے۔ عالیہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے اور اسی مرکزی کردار کے ذریعے پوری کہانی قاری تک پہنچتی ہے۔ عالیہ اپنے سرکاری ملازم باپ کی موت کے بعد اپنے دو دوھیال کے آبائی گھر میں اپنی اماں کے ساتھ آجاتی ہے۔ چھٹی، عالیہ کی بچپن کا زمانہ ہے۔ چھٹی کی ماں کی موت کے بعد اس کا باپ دوسری شادی کر لیتا ہے اور اسے اپنے بڑے بھائی کے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور کبھی پلٹ کر نہیں لیتا۔ بس ہر مہینے برائے نام خرچہ بھیج دیتا ہے گویا حالات کا جبر عالیہ اور چھٹی کو بڑے چچا کے آنگن میں لے آتا ہے اور یوں وہ اُس آنگن کا حصہ بن جاتی ہیں، جو ملک کی تقسیم کا گواہ ہے کیونکہ اس آنگن میں اُس دور کے مختلف سیاسی خیالات کے نمائندے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً بڑے چچا کو کانگریس سوچ کے مالک ہیں، جب کہ جمیل بسپا اور چھٹی اس دور کے عام مسلمان نوجوانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ مسلم لیگ اور پاکستان سے محبت کرنے والے کردار ہیں۔ عالیہ کی اماں ذہنی طور پر انگریز نوآبادی کے کردار ہے۔ کریمن بوا کوئی سیاسی یا نظریاتی کردار تو نہیں لیکن مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یادگار ضروری ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس دور کے تمام تر سیاسی محرکوں کو ایک چھوٹے سے آنگن میں متحرک کرداروں کے ذریعے پوری شدت کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔)

امتحان کے بعد جب عالیہ نے سر اٹھایا تو بہار جا چکی تھی۔ ہواؤں میں گرمی بس لگی تھی۔ نالی سے ڈھیروں پانی کیاری میں جاتا مگر پھولوں پر رونق نہ آتی۔ پتیاں مرجھا مرجھا کر جھڑتی رہیں، مارے پیاس کے ننھی ننھی چڑیوں کی چونچیں کھلی رہتیں اور چوہے کے پاس کام کرنے والی کریمن بوا کے ہاتھ سے پٹکیا نہ چھوٹی۔ شام کو صحن ٹھنڈا کرنے کے لیے کتنی ہی پانی کی بالٹیاں چھڑک دی جاتیں، پھر بھی سکون نہ ملتا۔ سارا ماحول جل رہا تھا۔ ان بے کار، ویران اور گرم دنوں میں بڑی چچی نے چھٹی کے جہیز کے پانچ جوڑے کپڑے اس کے سپرد کر

دیے تھے۔ دوپہر میں جب سنا سنا چھا جاتا تو وہ مشین پر کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ بڑی چچی سے تو اب کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت بھی کبھی سی رتیں۔ ان کا کسی کام میں جی نہ لگتا اور اماں تو ویسے بھی چھٹی کو برداشت نہ کرتیں۔ ان کا بس چلتا تو جہیز کے کپڑوں سے چھٹی کا کفن سی ڈالتیں۔ بس ایک عالیہ رہ گئی تھی جو بڑے خلوص سے جہیز سی رہی تھی اور ہر وقت چھٹی کے اچھے نصیب ہونے کی دعائیں کر رہی تھی۔

ادھر چھٹی تھی کہ اپنے نصیب کی بازی لگنے سے بے خبر سارے گھر میں اودھم ڈھاتی پھر رہی تھی۔ بڑے چچا کو دیکھتے ہی اسے پاکستان کا خیال ستانے لگتا۔ انگریزوں کو وہ بے نقط سناتی کہ اماں کے پھلے چھوٹ جاتے اور جب سب کو چڑا کر وہ تھک جاتی تو پھر عالیہ کے پاس آگھستی..... ”اے بچیا! یہ کس کے کپڑے سل رہے ہیں۔ ہے اللہ کتنے پیارے ہیں۔ یہ کون پہنے گا؟“ وہ اٹھلا کر پوچھتی۔

”کسی کے ہیں چھٹی“۔ عالیہ بہانہ کرتی کہ کہیں سچی بات کا پتا نہ چل جائے۔

”ایک دوپٹا ہمیں دے دیجیے اس میں سے، لچکا لگا کر اوڑھوں گی“۔ وہ پنپے ہوئے دوپٹے کو اٹھا کر مردوٹے لگتی..... دیکھیے! میرا دوپٹا کیسے لتے ہو رہا ہے۔“

چھوڑو چھٹی! چنٹ کھل جائے گی“ عالیہ دوپٹا چھیننے لگتی

”آخر یہ ہیں کس کے جہیز کے، بچاری بتا بھی نہیں سکتیں، زبان تھکتی ہے“۔ مارے تجسس کے چھٹی لڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔

”میں تم کو پیٹوں گی جو مجھ سے لڑیں“۔ عالیہ بڑے پیار سے اپنی بڑائی کا رعب ڈالتی تو چھٹی ہنسنے لگتی۔ آج دوپہر میں کیسا سا ٹاٹا ہے۔ وہ چھٹی کے دوپٹے میں کرن ٹانگ رہی تھی اور اپنے مستقبل کے خیالوں کا جان پر نازل کیے جاری تھی..... اگر وہ فیل ہوگئی، تو کیا ہوگا، اگر پاس ہوگئی تو لے دے کہ ایک ہی بات رہ جاتی کہ بیٹی کرے؛ استانی بن جائے، مگر کیا وہ بیٹی کر سکے گی؛ کیا اماں اسے علی گڑھ جانے دیں گی اور کیا مامور اسے اتنے روپے بھجواتے رہیں گے؟

ہائی سکول کے احاطے میں آم کے درختوں پر کوئل مسلسل چیخے جاری تھی اور پاس کے کمرے میں سو

ہوئی نجمہ پھوپھی کے خراٹے چھت سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی سو جائے اور اتنے خراٹے لے کہ نجمہ پھوپھی اپنی بے فکریند سے چونک پڑیں اور پھر ساری دوپہر بیٹھ کر کاٹ دیں۔
شام کو جب وہ نیچے آتری تو کریمین بوا مہن میں پانی چھڑک رہی تھی۔ جمیل بھیالوہے کی کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے اور بڑے چچا برآمدے میں ٹہل ٹہل کر جیسے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی سب سے بے نیاز تخت پر بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں۔
”بڑے چچا! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”سر میں درد ہے بیٹی۔“

بڑی چچی نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا..... ”کریمین بوا جلدی سے پلنگ بچھا دو، بس صحن ٹھنڈا ہو گیا۔“
”ماس جائے اس درد کا۔“ کریمین بوا برآمدے میں ایک طرف کھڑے ہوئے پلنگ اٹھا اٹھا کر آنگن میں بچھانے لگیں۔

بڑے چچا جمیل بھیالوہے کی طرف کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ عالیہ کو سخت کوفت ہو رہی تھی کہ بیٹا پاس بیٹھا ہے مگر باپ کو پوچھتا تک نہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا، دونوں کے درمیان بات چیت بند تھی۔

”تم آج دو دن سے گھر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟“ بڑی چچی نے جمیل بھیالوہے کی طرف دیکھا۔

”نو کری چھٹ گئی ہے اماں، سرکاری دفاتروں میں سیاسی لوگوں کا گزرا مشکل ہی سے ہوتا ہے۔“
عالیہ نے جل کر جمیل بھیالوہے کی طرف دیکھا۔

”مسلم لیگیوں کی کچت تو انگریز بہادر کے دفتری میں ہوتی ہے۔“ بڑے چچا نے کروٹ بدلے بغیر کہا۔

”آپ کا خیال غلط ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب کانگریس سفارش کر دیتے ہیں تو پھر نو کری مل جاتی ہے۔“ جمیل بھیالوہے کیوں پُچ رہے۔

”ہوں۔“

باپ بیٹے دونوں اپنے اپنے طنز کی آگ میں جل کر خود بخود بجھ گئے اور دونوں نے اس طرح منہ پھیر لیا

جیسے ایک دوسرے کو بات کرنے کے لائق نہ سمجھ رہے ہوں۔ عالیہ نے جمیل بھیالوہے کی نظر سے دیکھا اور بڑے چچا کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے سر سہلانے لگی۔ اماں گیلے بال جھکتی ہوئی غسل خانے سے نکل آئیں اور سب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر بڑی بے زاری سے پاندان اٹھا کر آخری پلنگ پر جا بیٹھیں۔

”اب کیا ہوگا؟“ بڑی چچی نے جمیل بھیالوہے سے پوچھا۔

”فکر نہ کیجیے اماں، ایک بڑی اچھی نو کری ملنے والی ہے، آپ سب کے ٹھاٹھ ہو جائیں گے۔“

”تکلیل کی پھر کوئی خیریت معلوم ہوئی یا نہیں؟“ بڑی چچی نے اچانک پوچھا۔

”اماں اس کی فکر نہ کیا کیجیے، وہ بڑے مزے میں ہے۔ یہاں کے سارے دکھ درد بھول گیا ہوگا۔“ جمیل

بھیانے پھر صفائی سے جھوٹ بولا۔ انھوں نے عالیہ کو ساری حقیقت بتادی تھی کہ انھیں تکلیل کا پتا تک نہیں معلوم۔

”خیر جہاں رہے خوش رہے۔“ بڑی چچی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”بڑے چچا! آپ کا پلنگ باہر چبوترے پر بچھوا دوں، کھلی فضا میں درد کم ہو جائے گا۔“ عالیہ نے

پوچھا۔ دو مختلف کنز نظریات ایک جگہ جمع ہو جاتے، تو اسے ڈر لگنے لگتا۔ تکلیل کے ذکر سے وہ پریشان تھی۔ جمیل بھیالوہے موقع چوکنے کا نام نہ لیتے۔

”ہاں! وہیں لگوا دو، تو بڑا اچھا ہو۔“ بڑے چچا نے اسے ممنونیت سے دیکھا اور پھر باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

گلی میں کانگریس بچوں کا جلوس نکل رہا تھا۔ وہ بڑے بے ہنگم طریقے سے شور مچا رہے تھے۔ ”جھنڈا اُونچا رہے ہمارا..... کانگریس زندہ باد، گاندھی جی زندہ باد، جواہر لال نہرو زندہ باد۔ ہندوستان نہیں بے گا۔ جھنڈا اُونچا رہے ہمارا.....“

بڑے چچا کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جمیل بھیالوہے

رہے تھے اور اماں جو بڑی دیر سے چپ بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں، آخر بول ہی پڑیں: ”پہلے آزادی تو مل جائے،

پھر سب ہوتا رہے گا اور پھر یہ ہندوستانی لوگ پہلے حکومت کرنا بھی تو سیکھ لیں۔“

سب چپ رہے۔ کسی نے اتناں کو جواب نہ دیا۔ باہر بڑے چچا کا بستر لگ گیا تھا۔ وہ چلے گئے اور جمیل بھینا پھر انگلیاں مروڑنے لگے۔ جلوس کا شور دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ چھمی دیوانوں کی طرح بھدر بھدر کرتی اپنے کمرے سے نکل پڑی..... ”اگر میرے دروازے کے پاس سے جلوس نکلا تو ڈھیلے ماروں گی“ وہ دروازے کی طرف لپکی۔

”خبردار! جو آگے بروہیں، پیٹھ جاؤ چپکے سے“۔ جمیل بھینا زور سے گرجے اور چھمی جانے کیسے رعب میں آگئی۔ اس نے جمیل بھینا کو گھور کر دیکھا اور بڑبڑانے لگی..... ”ہونہ! بڑے آئے پچارے، آج ہی مسلم لیگ کا جلوس نہ نکالا ہو تو میرا نام بھی چھمی نہیں۔“

جلوس دروازے کے پاس سے گزر گیا تو جمیل بھینا کپڑے بدل کر باہر چلے گئے۔ چھمی جیسے ان کے باہر جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ جمیل بھینا کے جاتے ہی برقع اوڑھ کر خود بھی باہر نکل گئی۔ عالیہ اسے نہ روک سکی۔ زمانے زمانے کی بات ہے، پہلے تو جب بی بیاں گھروں سے نکلتیں، تو دو دو چار چار ماماں ساتھ ہوتی تھیں“۔ کریمن یو چھمی کے یوں باہر نکل جانے پر ہمیشہ کڑھا کرتیں۔

عالیہ نے کواڑوں کی اوٹ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ بڑے چچا صاف ستھرے بستر پر پاؤں پھیلائے سکون سے لیٹے تھے۔ سامنے پتیل کے گھنے درخت سے چاند کی روشنی ابھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی باہر چوترے پر جائیٹھے۔

”عالیہ! بیٹی ایک پان کھلا دو“۔ بڑی چچی نے فرمائش کی تو وہ تخت پر آ بیٹھی اور پان دان کھول کر پان بنانے لگی..... وہ باہر چوترے پر جا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔

تخت کی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ اس نے مارے احترام کے ساری کا پلوسر پر ڈال لیا۔ کریمن یو ا جلدی جلدی لالٹینیں جلا رہی تھیں۔

”اللہ کلیل کو خیریت سے رکھیو“ بڑی چچی دونوں ہاتھ پھیلا کر دُعا کرنے لگیں۔ وہ اس وقت کتنی دکھی اور مامتا سے بھرپور نظر آرہی تھیں۔

اندھیرا ہر طرف در آیا تھا مگر چھمی اب تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ عالیہ کو خواہ مخواہ فکر ہو رہی تھی۔ ویسے گھر میں اور کسی نے نہ پوچھا کہ وہ ہے کہاں؟

ذرا دیر بعد چھمی آئی تو منہ سرخ ہو رہا تھا، سانس پھولی ہوئی تھی.....

”اے بیجا! میں نے وہ شاندار جلوس تیار کر لیا ہے کہ آپ دیکھتی رہ جائیں گی۔ بس ذرا دیر میں ادھر سے گزرنے والا ہے۔ عذرا کی اتناں نے جھنڈا بنایا؛ طاہرہ کی اتناں نے ایک بوتل مٹی کا تیل دیا تھا؛ میں نے مشعلیں تیار کیں؛ سارے محلے کے لڑکوں کو جمع کر دیا ہے۔ ہائے! بڑے چچا دیکھیں گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ میں نے سارے لڑکوں کو سمجھا دیا ہے کہ میرے دروازے پر آ کر خوب نعرے لگانا“..... چھمی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی اور پھر برقع پھینک کر جلوس کے انتظار میں بیٹھنے لگی۔

خوشیوں کا کوئی پیمانہ اُس وقت چھمی کی مسرت کو ناپ نہیں سکتا تھا۔ عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں یہ ننھے منے بچوں کا جلوس گھر میں فساد نہ کرا دے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اوپر اپنے کمرے میں کھسک لے۔ دور سے بچوں کے نعروں کی آواز آرہی تھی۔

بڑے کمرے سے گزرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ نجمہ پھوپھی اپنے صاف ستھرے بستر پر لیٹی کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ گرمیوں میں چھت پر نجمہ پھوپھی کا ڈیرہ جمتا تھا، اس لیے وہ اپنے کمرے کے پاس والی چھوٹی چھت پر گزارہ کر لیتی۔

جلوس قریب آ گیا تھا۔ بچے بڑے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے: ”مسلم لیگ زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد، بن کے رہے گا پاکستان، دھتیاراج نہیں ہوگا، چٹیاراج نہیں ہوگا“۔

عالیہ چھت کی منڈیر سے جھک کر گلی میں جھانکنے لگی۔ دو بڑے لڑکے مشعلیں اٹھائے سب سے آگے تھے۔ ”نہیں دیکھنے دیا خالم نے“..... چھمی بھاگتی ہوئی آئی اور عالیہ کے برابر کھڑی ہو کر نیچنگلی میں آدھی لٹک گئی..... ”ہائے! کیسا شاندار جلوس ہے۔ وہ آپ کے بڑے چچا نے مجھے دروازے سے جلوس نہیں دیکھنے دیا، جل کر خاک ہو گئے حضرت“۔

جھمی! ذرا سرک کر جھانکو، کہیں جلوس کے ساتھ تمھاری لاش نہ نکل جائے،“ عالیہ نے جھمی کے لٹکتے ہوئے دھڑکواپنی طرف کھینچا۔

”ہائے بچیا! میں نے مشعلیں کیسی اچھی بنائی ہیں، ہیں نا؟“ جھمی نے داد طلب نظروں سے دیکھا.....
آج تو آپ کے بڑے چچا جلتے جلتے ختم ہو جائیں گے۔“
جھمی! کیسی باتیں کرتی ہو، بس پتا چل گیا کہ تم لگی و لگی کچھ نہیں ہو، بڑے چچا کو جلانے کے لیے یہ سوا نگ رچایا ہے۔“

”واہ، ہوں کیوں نہیں۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی اور عالیہ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جھول گئی۔

جلوس گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا تو تھکی تھکی سی جھمی عالیہ کے بستر پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی اور عالیہ خاموشی سے ہنسی رہی۔۔۔ اب کتنے دن یوں سب کو جلانے جھمی بیٹھی رہے گی۔ آخر تو ایک دن اپنے گھر چلی ہی جائے گی، جانے وہ گھر بھی اس کا گھر بنے گا کہ نہیں۔ جھمی کو وہاں محبت ملے گی یا نہیں۔ کیا وہاں بھی وہ سب سے بدلے چکانے کے طریقے ایجاد کر کے زندگی گزارے گی۔

”عالیہ بیٹیا اور جھمی بیٹا، دونوں کھانا کھانے نیچے آ جاؤ۔“ کریم بوا کی آواز آئی۔ (آگن)

مشق

- ۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں۔
- ۱۔ عالیہ کس کے جہیز کے کپڑے سی رہی تھی؟
- ۲۔ بڑے چچا کو کچھ کر جھمی کو کیا خیال ستانے لگتا؟
- ۳۔ جمیل اور بڑے چچا میں اختلاف کی کیا وجہ تھی؟
- ۴۔ کاگری جلوس دیکھ کر جھمی نے کیا رد عمل ظاہر کیا؟
- ۵۔ کیا جھمی واقعی مسلم لڑکی تھی؟
- ۶۔ بڑے چچا کو چوتھے پر لینے دیکھ کر عالیہ کے دل میں کیا خواہش پیدا ہوئی؟

جھمی کے کردار پر چند سطریں لکھیں۔

۲۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

۳۔ بے نقط، شانا، تجسس، کوفت، ہونا، بے بنام، مبہم، سوا نگ رچانا۔

۴۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

۱۔ باپ بیٹے دونوں اپنے اپنے طنز کی آگ میں جل کر خود بخود بجھ گئے اور دونوں نے اس طرح منہ پھیر لیا

جیسے ایک دوسرے کو بات کرنے کے لائق نہ سمجھ رہے ہوں۔

۲۔ پہلے آزادی تو مل جائے، پھر سب ہوتا رہے گا اور پھر یہ ہندوستانی لوگ پہلے حکومت کرنا بھی تو سیکھ لیں۔

۳۔ خوشیوں کا کوئی پتا نہ اُس وقت جھمی کی مسرت کو ناپ نہیں سکتا تھا۔

۴۔ ماحول اور حالات انسانی رویوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے جھمی کے کردار پر بحث کریں۔

۵۔ درج ذیل عبارت کی تلخیص کریں، جو اصل عبارت کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔

موجودہ دور میں یوں تو ہزار ہا مسائل ایسے ہیں جن کا تسلی بخش اور کسی قدر کارآمد حل تلاش نہیں کیا جاسکا لیکن دو مسائل ایسے ہیں جو دنیا بھر کے سائنس دانوں کی توجہ کا خاص مرکز بنے ہوئے ہیں، پہلا مسئلہ، خلائی تحقیق اور دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ انسان جاننا چاہتا ہے کہ ہماری اس زمین سے پرے کون کون سی دنیائیں آباد یا غیر آباد ہیں اور اگر ضرورت پڑے تو انسان زمین کو چھوڑ کر کس دنیا میں آسانی سے پناہ لے سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ قطعی داخلی نوعیت کا ہے، یعنی کرۂ ارض پر رہتے ہوئے ہم اپنے لیے کس قدر مزید آسانیاں بہم پہنچا سکتے ہیں۔ دنیا سے بھوک، جہالت، افلاس اور امراض کا خاتمہ کرنے کے لیے ابھی ہمیں کن کن مراحل سے گزرنا ہے اور وہ کون سے طریقے ہیں، جن کی مدد سے بنی نوع انسان خوشگوار، محفوظ اور آرام دہ زندگی گزار سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ارض کا داخلی مسئلہ خارجی مسئلے کی نسبت کہیں زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ چاند یا مشتری پر کوئی مشین قائم کرنا آسان ہے لیکن دنیا سے افلاس، جہالت اور امراض کا خاتمہ کرنا سخت مشکل، دشوار اور پریشانی کا باعث ہے۔

ہدایت برائے اساتذہ: طلبہ کو تلخیص کا مفہوم بتائیں اور تلخیص کی مشق کروائیں۔

آغا حشر کاشمیری



پیدائش: ۱۸۷۹ء

وفات: ۱۹۳۵ء

آغا حشر بنارس میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور و معروف کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی تعلیم حافظ عبدالصمد کے مدرسے میں ہوئی۔ مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد جے نارائن سکول میں داخل ہوئے، وہیں سے انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ زمانہ طالب علمی میں احسن لکھنوی کے ایک ڈرامے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ڈرامہ نگاری کو ہی اپنا اوڈھنا بچھونا بنالیا اور کم عمری ہی میں شہرت حاصل کر لی۔ سکول ہی کے زمانے میں انھوں نے ”آفتابِ محبت“ نامی ڈرامہ لکھا۔ ڈرامہ نگاری کے شوق میں بمبئی چلے گئے اور یوں تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔

ان کا پہلا مقبول ڈرامہ ”مرید شک“ تھا۔ انھوں نے اردو ڈراموں میں ایک نئی جہت پیدا کی اور سٹیج ڈراموں کو بآزاری بن اور عامیانه ماحول سے نکال کر خالص ادبی صنف بنایا۔ آغا حشر کو زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ شاعرانہ تخیل کو سیدھے سادے الفاظ اور عام بول چال میں بیان کرتے۔ آغا حشر کی ہدیہ گوئی بہت مشہور ہے۔ وہ اتنی جلدی اشعار کہتے تھے کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی۔ ان کے ڈراموں کی کامیابی میں ان کا شاعرانہ اسلوب بھی کارفرما ہے۔ ان میں مکالمہ نگاری کی استعداد بہت تھی۔ ان کے مکالموں میں مبالغے کا انداز ہے، لیکن ان کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔

قصائِف: رستم و شہزاد، صید ہون، دیو دہی کی بڑی خواب بستی، اسیر حرص اور خوب صورت بلا، نیک پادشہ، پادشہ و وزیر،

Not For Sale

62

آغا حشر کاشمیری

خوب صورت بلا

کردار:

نیکی، بدی، شمسہ، توفیق، قلوخان، طغرل بیگ۔

شمسہ: ملکہ، جس نے سازش کر کے اپنے بھائی بادشاہ برجیس کو قتل کیا اور خود حکومت سنبھال لی اور اب اپنے بیٹے شہزادہ سہیل کو قتل کر کے اپنے بھائی کا نام و نشان مٹانا چاہتی ہے۔
قلوخان اور طغرل بیگ: شمسہ کے وفادار اور معتمد
توفیق: مقتول بادشاہ برجیس کا وفادار، جو اپنی جان پر کھیل کر شہزادہ سہیل کی جان بچانا چاہتا ہے۔

(نیکی کا آنا)

نیکی: خداوند کا جلال ہو مقدس ہے وہ خدا جو آدم کے سرکش اور باغی بیٹوں کو ماں باپ کی طرح پیار کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ انسان جو سچے دل سے اور پوری سچائی کے ساتھ اس کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ اے گمراہ ہستی! جو اندھی اور دیوانی بنی تباہی کے غار کی طرف دوڑی جا رہی ہے، آروشنی کی طرف آ۔ خدائے رحیم تیری پکار پر کان لگائے ہے۔ اُس کی رحمت تجھے گود لینے کے لیے محبت کے بازو پھیلائے ہے۔

جس راہ میں ہوں ٹھوکریں، وہ راہ اے انسان نہ چل
جرم و گنہ کے بوجھ سے ورنہ گرے گا منہ کے بل
تاریکیاں ہیں ہر طرف، اندھا نہ بن، اب بھی سنبھل
ایمان کا فانوس لے اور اُس میں جلا شمعِ عمل

Not For Sale

63

انچہ بھاگ، بوڑا آس طرف، طاقت ابھی ہے پاؤں میں
آرام و راحت، اونٹنی، سب ہیں خدا کی چھٹاؤں میں

(آکر) میں ہوں جہان کی خوشی، میں ہوں۔

دُنیا کی مصیبت، خُدا اور انسان کے بیچ دیوار۔

دنیا کی قسمت میرے داہنے ہاتھ میں ہے اور اس کی کنجی میرے بائیں ہاتھ میں ہے۔ تم جو بہشت کی

اُمید میں دنیا کو دوزخ بنائے ہوئے ہو، میری طرف آؤ اور میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ میری سخاوت کے بادل
سوتلی برسائیں گے اور تمہارے دامن کو بھی مالا مال کر دیں گے۔

جھوٹی ہے۔ تو آدمی کو ذلت، مصیبت اور خوفناک موت کے ہوا کچھ نہیں دے سکتی۔

پ! ٹو ہی میری طرف آنے والوں کو روکتی ہے۔

روٹونیک راہ چلنے والوں کو جہنم کے اندھیرے غار میں گراتی ہے۔

نہ ہوتی تو دنیا میں بہشت کا مزہ آتا۔

۱! تُو نہ ہوئی تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا۔

! لڑائی چھوڑ

! بڑائی چھوڑ

!دنیا عاشقوں کا بازار ہے۔ اس میں کوئی تیرا خریدار ہے کوئی میرا طلب گار ہے۔

آؤنق ت بن یو س ماشقوں کو تیری صورت سے

تو مجھ سے کہنا یہ کہ جی ہاں ہے، جہاں تو اپنی قسمت سے

جو آئی ہوئے ہیں دنیا کی حرکت م

اسے بیٹھے ہیں ببول سے کہہ رہے ہیں (تم)

سید محمد علی

Not For Sale

64

۔ جس روز روشنی میں دیکھیں گے شکل تیری

نفرت کی ٹھوکروں سے پھینکیں گے دور تجھ کو

نادان! کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ دنیا کی مٹی خود غرضی اور لالچ کے پانی سے گوندھی گئی ہے۔

جھوٹی! تیرا ہر لفظ عداوت سے بھرا ہے۔ دنیا کا چین بس میری ہی کوشش سے ہرا ہے۔

بدی: بس کر قیل وقال۔ اب دیکھ میرے عاشقوں کا حال۔

(طغزل کا شراب پیتے دکھائی دینا، ساتھیوں کا گانا)

گاتا: اے پیارے مہاراجا۔ دُلا رے مہاراجا۔ پیالے مے کے پی لوجی

پیو جانی، پیالے مے کے پی لوجی۔ اے پیارے۔۔۔۔۔

دوسرا: ۱۔ بہار آئی ہے بھر دے بادہ لگلوں سے پیانہ

رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ

بدی: میرے عاشقوں کا حال دیکھ چکی۔ اب اپنے چاہنے والوں کی ذلت اور مصیبت دیکھ۔

بدی ہوئی شرط! دیکھنا میں ہارتی ہوں یا تو ہارتی ہے۔ (جانا)

(پردہ ہوتا ہے اور شمسہ کا عالی شان مکان نظر آتا۔ سب درباریوں کا دست بستہ دکھائی دینا)

ع پہلا چو بدار: جلال ہمارا، کمال ہمد، عروج مانید چھتر سر پر

ع زمانہ حامی، فلک محافظ، سپہر بندہ، ستارہ چاکر

ع نصیب درباں، قضا ملگس راں، قدر ثنا خواں، ہو بخت یا ور

ع. سحاب قلزم، قدم قدم پر، زر و جواہر نثار سر پر

ع۔ وقار ہر سمت چھار ہا ہے، دلوں کی عظمت بڑھار ہا ہے

ع دوسرا! حضور تشریف لا رہی ہیں، کھڑے ہوں خدام سر جھکا کر

رہیں حکم سے تخت و تاج، ملک و راج، مال و منال۔ بلند نام ہو

Not For Sale

65

پارسائی ہو، جس نے فرشتوں کی طینت اور حور کی عصمت پائی ہو۔ تو کبھی عورت نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ٹو
نے معصوم شہزادے کا دغا سے حق چھینا ہے، اسی طرح عورت کے نام پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔

توفیق: اسن

سراش سے آگ جو برساؤں وہ اُژدر ہوں میں
جند میں طوفان ، تو غصے میں سمندر ہوں میں
جیس ڈالوں گی ، سنا دوں گی ، فنا کر دوں گی
یاد رکھنا ! تری تقدیر کا چکر ہوں میں

توفیق:

سے بل کا جوش ایسے ذراوے سے کہیں گھٹتا ہے موم سے پتھر فولاد کہیں دھتا ہے
مت سمجھو دل سے مرے زہر دغا لٹکے گا چیر کر دیکھ شرافت سے بھرا لٹکے گا
- رومیوں روئیں کی زباں پر یہ سخن جاری ہے

جان پیاری نہیں، دنیا سے وفا پیاری ہے

توفیق: دیوانے! کیوں جان کر دنیا کی خوشیوں سے بے زار ہے۔ تیری ایک ہاں پر شاہی مہربانیوں کا بادل
عزت، دولت اور رحم کی بارش برسانے کے لیے تیار ہے۔

توفیق: مجھے کوئی ایسی مہربانی نہیں چاہیے۔ اور جس کے غلام! یاد رکھ یہ کلام

سے چار دن ہے شان و شوکت کا خمار موت کی کڑی نشہ دے گی اُتار
جب اٹھائیں گے جنازہ مل کے یار ہاتھ مل مل کے کہے گا بار بار

کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

جو یہاں پایا نہیں سب دھڑ چلے

توفیق: بس بس یہ وعظ پاگوں کے لیے رکھ چھوڑ، سہیل کو ہمارے حوالے کر۔ تاج کا تابعدار ہو، ورنہ خوفناک

انجام کی پیشوائی کے لیے تیار ہو۔

توفیق: کیا معصوم شہزادے کو تم قصا بوں کے چنچے میں ذبح ہونے کے لیے دے دوں؟ رحم اور انصاف کے نگلے
پر چھری پھیر دوں؟ تخت و تاج کے لیروں کو تعظیم کروں؟ شیطان کو بہشت کا مالک و وارث تسلیم کروں؟
نہیں! وفا دار توفیق سے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

توفیق: مگر تم کو ایسا ضرور کرنا پڑے گا۔

توفیق: کیوں؟

توفیق: ہمارا حکم

توفیق: تیرا حکم کوئی خدا کا حکم نہیں ہے۔

توفیق: میں شاہی حکم دیتی ہوں۔

توفیق: میں تیری شاہی سے بھی منکر ہوں۔

سے تیر و تلوار و تبر نیزہ و خنجر برسیں زہر، خون، آگ، مصیبت کے سمندر برسیں
جلیاں چرخ سے اور کوہ سے پتھر برسیں ساری دنیا کی بلائیں مرے سر پر برسیں

ختم ہو جائے براک رنج و مصیبت مجھ پر

مگر ایمان کو جنبش ہو، تو لعنت مجھ پر

توفیق: غور کر پھر غور کر ورنہ اجل تیار ہے تیرا سر ہے اور اس جلاذ کی تلوار ہے

توفیق: مصیبت کے ڈر، رنج کے ہول سے بہادر بدلتے نہیں قول سے

خدا لے لے کہ تُو لے، یہ جاں ایک ہے مگر بات ایک اور زباں ایک ہے

توفیق: مجھ پہ لعنت ہے جو تجھ کو اب میں زندہ چھوڑ دوں کاٹ لاسر، تاکہ اس کو ٹھوکروں سے پھوڑ دوں

(جانا) سین ختم

مشق

- ۱۔ ذرا سے کی تعریف کریں اور آغا حشر کاشمیری کے چند دیگر ڈراموں کے نام لکھیں۔
- ۲۔ ہدی نے اپنی تعریف میں جو کچھ کہا، اسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
- ۳۔ شمر نے توفیق سے کیا مطالبہ کیا؟
- ۴۔ مفتی نثر کے کہتے ہیں۔ اس سبق میں سے مفتی نثر کی کم از کم پانچ مثالیں لکھیں۔
- ۵۔ توفیق نے عورت کی تعریف کن جملوں میں کی ہے؟
- ۶۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔
مرکز، عداوت، قیاس، قول، محترم، پایہ تجر، طینت، اثر، جذبہ، چرخ، سحاب، تیر۔
- ۷۔ توفیق کے کردار کے بارے میں چند سطوریں لکھیں۔
- ۸۔ ”تیرے دل سے چل میں ہے“ یہاں شیر بہادر آدمی کے لیے استعارہ ہے۔ استعارے کی تعریف کریں اور مثالیں دیں۔
- ۹۔ اپنے معاشرے اور ماحول کے حوالے سے قلو کے کردار کا تنقیدی جائزہ پیش کریں۔
- ۱۰۔ جب کسی جملے میں دو افعال اکٹھے استعمال ہوں، ان میں ہر دوسرا فعل امدادی فعل کہلاتا ہے۔ امدادی فعل کے استعمال سے جملہ مؤثر اور واضح ہو جاتا ہے۔ جیسے: آجانا، کھالیا، دے دیا، مار ڈالا، سو گیا وغیرہ۔ کوئی سے پانچ جملے لکھ کر ان میں امدادی فعل کی نشاندہی کریں۔

سرگرمی: اساتذہ طلبہ سے اس ڈرامے کے مکالموں کی درست تلفظ کے ساتھ بلند خوانی کروائیں۔

ہدایت برائے اساتذہ: طلبہ کو استعارے کی تعریف مع ارکان، مثالوں کے ذریعے بتائی جائے۔

خواجہ معین الدین



پیدائش: ۱۹۲۴ء

وفات: ۱۹۷۱ء

خواجہ معین الدین حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن میں حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ سندھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ انھوں نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں بڑی مشقت کے بعد بچوں کے لیے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی۔ سکول کے قیام کے لیے چندہ مہم میں انھوں نے ایک ڈراما ”زوال حیدر آباد“ بنایا اور اس کی ساری آمدنی سکول کے لیے وقف کر دی۔ یہیں سے خواجہ معین الدین اور اوروڈراما لازم و ملزوم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد اوروڈرامے اور تھیٹر میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے ڈراموں میں سماجی طنز، تہذیبی روایات اور تبدیلی ہوتے اقدار کی واضح جھلک موجود ہے۔

تصانیف: لال قلعے سے لالوہیت تک، مرزا غالب بندر روڈ پر اور تعلیم بالقبائل وغیرہ۔

تعلیم بالغاں

(ایک ایکٹ کا نظریہ و مزاحیہ کھیل)

کردار جس ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں۔

☆ مولوی صاحب ☆ قصاب

☆ نجام ☆ وکٹوریہ والا

☆ مولوی صاحب کی بیوی (پس پردہ)

مقام: بکرا پیڑھی کراچی کی ایک کچی بستی

سیٹ: ایک جھونپڑی

زمانہ: ۱۹۵۴ء

وقت: صبح

منظر

ایک شگستری جھونپڑی جس کے دائیں جانب ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اندر کی جانب جھونپڑی کا زمانہ حصہ ہے۔ پردے کے قریب ہی ایک گھڑوچی رکھی ہے، جس پر تین گھڑے رکھے ہیں۔ دو ٹوٹے ہوئے اور ایک ثابت..... ثابت گھڑے پر چاک سے ”یقین محکم“ لکھا ہے۔ دوسرا گھڑا پینڈے اور گٹھے کی جانب سے ٹوٹا ہوا ہے جس پر ”تنظیم“ لکھا ہے اور تیسرا گھڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اور ایک ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پر ”اتحاد“ لکھا ہے۔ جھونپڑی کے درمیان میں مدرسے کے اُستاد محبت علی کی چار پائی پڑی ہے۔ جھونپڑی

کے بائیں جانب ایک تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) اسٹینڈ پر رکھا ہے، جس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

”مدرسہ تعلیم بالغاں۔ بکرا پیڑھی، میوہ شاہ لائن، کراچی، حکومت اسلامی، پاکستان۔

صدر مدرس محبت علی۔“

پردہ اٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُستاد محبت علی چار پائی پر بیٹھے ہیں اور ایک ازار بند بن رہے ہیں۔ دائیں جانب قصائی اپنا کندہ اور چھڑے لیے بیٹھا ہے۔ پس منظر سے ایک آواز یہ شعر پڑھتی ہے:

- یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

(آخری مصرع پر قصائی اپنے ہنجرے ایک دوسرے پر گڑ کر تیز کرتا ہے۔)

شمشو نجام: (باہر سے آواز آتی ہے) مولوی صاب، مولوی صاب۔

مولوی: (دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے) ارے کون؟

نجام: (اندرا آتے ہوئے) میں ہوں مولوی صاحب۔ آپ کا شاگرد شمشیر علی عرف شمشو۔ (نجام اندر آتا ہے، جس کے ہاتھ میں ایک ٹین کا بستہ نماڈبہ ہے جس پر اس کا نام اس طرح لکھا ہے: ”شم شیر علی“)

مولوی: (پیارے اسے گلے لگاتے ہوئے) ارے شمشو! تو آگیا بیٹے۔ شمشو بیٹے تو نے کہا تھا کہ جمعے کے دن میرے پاس بہت گاہک ہوتے ہیں۔ بھتے کو بچے کے بال کاٹ دوں گا۔ کاٹ دیے بیٹے۔

نجام: (فخریہ انداز میں) کاٹ دیا ہوں مولوی صاحب۔ انگریزی بال کاٹا ہوں۔

(مولوی صاحب قصائی کی پیٹھ پر ڈنڈا مارتے ہیں)

مولوی: چل بے دھند بند کر اور وہ درخواست پڑھ کر سنا۔

قصاب: کون سی جی! وہ جو حکمہ تعلیم کو لکھوائی تھی؟

مولوی: (اسی غصے میں) ہاں وہی۔

(قصائی برابر رکھے ہوئے رجسٹر میں سے درخواست نکال کر پڑھنا شروع کرتا ہے۔)

سات سوچھائی بنے بیانوے۔

قصاب: (ڈنڈا مار کر) ارے وہ تو اسم اللہ کی جگہ تھا جاتا ہے تاکبخت۔ آگے پڑھ۔

مولوی: (پڑھتے ہوئے) عالی جناب عزت مآب و فضیلت مآب و..... زیر تعلیم۔

قصاب: (گھبرا کر) ہائیں زیر تعلیم (ڈنڈا) ارے! وہ وزیر تعلیم ہے نا۔ ہزار دفعہ پڑھا

مولوی: چکا ہوں، واؤ پڑھ کر پڑھ۔ (سمجھاتے ہوئے) دیکھ! واؤ سے ووٹ ہے نا۔

(حجام اور قصائی توجہ سے سنتے ہوئے۔)

ہے!

مولوی: ووٹ کا واؤ زیر تعلیم کے آگے لگا دیتے ہیں، تو زیر تعلیم، وزیر تعلیم بن جاتا ہے۔

(خوش ہو کر) واہ! کیا اللہ کی شان ہے مولوی صاحب۔

مولوی: (ڈنڈا اٹھاتے ہوئے) ہاں! بتاؤں اللہ کی شان۔

(حجام ڈر کر سٹ جاتا ہے۔)

مولوی: چل! آگے پڑھ۔

قصاب: (پڑھتے ہوئے) وزیر تعلیم صاحب دام اقبال ہو ہو ہو۔

مولوی: (ڈنڈا مار کر) ہو ہو ہو۔ یہ ہو ہو ہا ہا ہی ہی کیا کر رہا ہے؟ اسے کوئی ریڈیو پاکستان سمجھ رہا ہے کہ

جہاں اقبال کا نام آیا، شروع ہو گئی قوالی۔ آگے پڑھ۔

قصاب: (پڑھتے ہوئے) دام اقبال! (مشکل سے ادا کرتا ہے) ہم جملہ خور و دکلاں یہاں خیریت سے رہ کر آپ

کی خیریت درگاہ خداوندی سے نیک مطلوب۔

مولوی: (ایک دم روک کر) نیک مطلوب کے آگے چاہتا ہوں بھی لکھ دے۔ یہ نہیں سمجھیں گے، تو یہ سمجھ

چاہیں گے۔

قصاب: (لکھتے ہوئے) نیک مطلوب چاہتا ہوں۔

مولوی: آگے پڑھ۔

قصاب: (پڑھتے ہوئے) دیگر کوائف یہ ہیں کہ مدرسے کا کام عہدگی سے چالو ہے۔

مولوی: (روک کر) ہاں۔ یہ جملہ بہت اہم ہے۔ اس کے اوپر انڈر لائن کر دے۔

قصاب: (حیران ہو کر) اوپر انڈر لائن کروں؟

مولوی: (چڑ کر) اور نہیں تو کیا یہ نیچے کرے گا؟

قصاب: (ڈر کر) اچھا اچھا۔ (لائن لگاتے ہوئے) اوپر انڈر لائن۔ مگر چھ ماہ سے تنخواہ نہ ملنے کے سبب مدرسے

کوشاگردوں کا قرضہ ہو گیا ہے۔

(باہر سے خان صاحب کی آواز آتی ہے)

و کٹوریہ والا: (باہر سے آواز) مولی صاحب۔ خومولی صاحب۔

مولوی: (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے کون؟

قصاب: اجی آپ کا شاگرد چراغ شاہ پکار رہا ہے مولوی صاحب۔

مولوی: (خوش ہو کر) اچھا۔ چراغ شاہ نے میری شاگردی قبول کر لی؟ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ،

”بابا اگر وزیر بننا ہے تو کم سے کم دستخط کرنا سیکھ لو۔“

قصاب: لیکن مولوی صاحب۔ وہ تو کہتا تھا کہ اب کے میں ایک مہر بنالوں گا مہر۔

مولوی: (بے نیازی سے) ہاں، حکومت کے کام تو مہر سے بھی چل سکتے ہیں لیکن منتخب ہونے کے

بعد دوسروں کی لکھی ہوئی تقریر کو خود پڑھنا پڑتا ہے۔ نہیں تو پبلک پیمانہ کر نعرے لگا دیتی ہے۔

و کٹوریہ والا: (زور سے آواز دیتا ہے) مولی صاب۔ خومولی صاب۔

مولوی: (چڑ کر) ارے کون کبخت ہے یہ؟

قصاب: ارے اپنا چراغ شاہ مولوی صاحب۔ پھو (حجام اور قصائی آواز دیتے ہیں)

حجام اور قصاب: ارے آ جا پھو۔ کیا باہر کھڑا مولی صاحب مولی صاحب کر رہا ہے۔

(خان صاحب و کنویریہ والا) دائیں جانب کے ونگ سے داخل ہوتا ہے بنیان اور شلوار پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں تپتی ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی دوبار تپتی ہوا میں جھٹاڑتا ہے۔ تپتی سے چٹا چٹا کی آوازیں نکلتی ہیں)

(ڈرتے ڈرتے اک..... کیا..... بات ہے ہفتہ بیٹے۔ آج اسے دنوں کے اہل مدد سے
کے ہوا اور وہ بھی بغیر کسی کے اور یہ بات خود میں چلی کہہ رہی ہے بیٹے۔"

مولوی صاحب۔ یہ کتنی ہوتی بہت بُری چیز ہے۔ اس سے تو بڑے بڑے شیر بھی سیدھے ہو جاتے ہیں۔
(حجام کو دُعا مارتے ہوئے) ارے چپ رہ کمبخت (خان صاحب سے) ارے چھو۔ میں نے تجھ
سے بیس روپے ادھار لیے تھے۔ دس روپے تو واپس کر چکا ہوں (گواہی کے طور پر حجام اور قصائی
کو دکھاتے ہیں)

دکنور پر ۱۹۱۱ء (پتلی جھارکھر) خوباتی دس کا کیا ہوگا۔

۔ پنہو۔ جب حکومت نے ہماری گرانٹ آجی کر دی ہے تو میں تیرے پورے چپے کیسے دے سکتا ہوں۔

(نہرے)۔۔۔ یہ عجب اکسہ ہے، جگمگ کی جگمگ کھائے جا رہا ہے۔

(چونک کر) ارے رے رے۔ ارے وکٹوریہ کہاں چھوڑا۔ تیرا گھوڑا میری جگہ کھا رہا ہے۔
(دوڑ بڑے رسید کرتا ہے) بھاگ۔ ارے بھاگ۔

(ہنستے ہوئے) مان گئے مولیٰ صاحب مان گئے آپ کو۔

(خود بھی خوش ہوتے ہوئے) کیا بات ہے! کیا بات ہے! میں نے کوئی کارنامہ کیا ہے؟

(خوش ہو کر) اچی سنتی ہو (بیوی کو آواز دیتے ہیں) میں نے ایک کارنامہ کیا ہے (تجاسم اور قدماں سے) ذرا زور سے بولو بچے کا نام سن لی آیا ہوا ہے۔

(غصے میں دونوں کو ایک ایک ڈنڈا رسید کرتے ہوئے) چپ۔ چپ۔ کم بختوں نے قرض لینا بھی مشکل کر دیا۔ ارے بابا میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میں نے قرض لیا تو کیا ہوا۔ آج کل تو بڑی بڑی حکومتیں قرض لیتی ہیں۔

(غلیں ہو کر اپنے آپ سے) اور اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ شگرد آستہ کو تپتی دکھانے لگے ہیں
(لکھتے ہوئے دہراتا ہے) تپتی دکھانے لگے ہیں۔

(چونک کر) ارے کاٹ۔ کاٹ۔

ایک ہلاک بورڈ (بلیک بورڈ)..... ایک لکڑی کا صندوق.....

(لکھتے ہوئے) ایک لکڑی کا صندوق۔

(جس پر صندوق کی آویز لگائی گئی ہو) قابلیت دیکھ رہے ہیں۔ صندوق صواب سے لکھا گیا ہے۔

(جس پر صندوق کی آویز لگائی گئی ہو)

(بگڑ کر) صندوق صواب سے ہے مولوی صاحب۔

صواب سے ہے؟

صواب سے ہے۔

ارے دو سا گوان کا ہے نا۔ میں بھی ہمیشہ سے یہی غلطی کرتا آیا تھا۔ خدا سلامت رکھے۔ ایک دن

انسپکٹر آف سبب معائنے کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے میری یہ غلطی درست کی۔

(حیران ہو کر) کوئی غلطی؟

جی ہاں، مولوی صاحب کا صندوق "س" سے لکھنا چاہیے۔

(مشکل اڑاتے ہوئے) ہوں۔ سا گوان کا صندوق "س" سے اور شیشم کا شیشی.....

(جملہ پورا نہیں ہو پاتا کہ مولوی صاحب کا ڈنڈا پڑتا ہے)

کیوں؟ شیشم کا شیش سے نہیں ہو سکتا؟ ارے جو انسپکٹر صاحب چاہے وہی ہو سکتا ہے سمجھا؟

(چوت پر تڑپ کر) ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔

(توجہ دلانے کے لیے لکھتے ہوئے) ایک لکڑی کا "س" سے صندوق.....

ونیز۔

انٹس

(پہلے منہ منہ کرتے ہیں پھر جبرے پھیلا کر)

(نقل کرتے ہوئے)..... نیز۔

ہاں شاہاش، وہ کیجیہ جام و شیش سے تیرے کو نہیں ہے۔

Not For Sale

(لکھتے ہوئے) ونیز۔

(لکھتے ہوئے) تین گھرے..... مسی اتحاد..... تنظیم..... اور یقین محکم عطا کیے گئے تھے

..... (اٹھ کر گھڑوں کی طرف جاتے ہیں) سودرے کے ناچکار طالب علموں نے..... آپس

میں لڑ جھگڑ کر..... اتحاد کے کھڑے کھڑے کر دیئے ہیں۔ (ٹوٹا ہوا گھڑا اٹھا کر دکھاتے ہیں جس

پر چاک سے "اتحاد" لکھا ہے)

مولوی صاحب۔ یہ اتحاد کے کھڑے کھڑے کس نے کیے مولوی صاحب۔

ہائیں۔ خدای تو کرے کہ یہ چوبی رہا ہے۔ ارے کر، منہ رکھا تو نہیں ہے؟

(خبر سے سینے پر ہاتھ مار کر) اچی میں تو بانس بریلی کا ہوں۔ بانس بریلی کا۔

(چڑانے کے انداز میں نقل کرتے ہوئے) اچی میں تو بانس بریلی کا ہوں، بانس بریلی کا۔ کھاتے

پاکستان کا۔ گاتے بانس بریلی کا۔ آج جس کو دیکھو کوئی سندھی ہے، کوئی پنجابی ہے۔ کوئی بلوچی

ہے، کوئی پٹھان ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رہا ہے اور لائق شاگرد پوچھ رہے ہیں

کہ اتحاد کے کھڑے کھڑے کس نے کئے مولوی صاحب؟ ارے کھڑے کھڑے تو تمہارے ہونے

تھے کم بخنو۔

(شرمندہ ہو کر لکھنے لگتا ہے) اتحاد کے کھڑے کھڑے کر دیے ہیں۔

(دوسرا گھڑا اٹھاتا ہے جس پر "تنظیم" لکھا ہے) تنظیم کا گھڑا غائب اور پینڈے میں سودا ہوا گیا

ہے۔ (گھرے کا گھڑا اور پینڈا دکھاتے ہوئے)

(اس عرصے میں جام بیڑی جلا کر پینے لگتا ہے)

(بیڑی پیتے ہوئے) خیر یہ اتحاد کے تو کھڑے کھڑے ہو گئے تھے۔ پر یہ تنظیم کا گھڑا کس نے غائب

کیا مولوی صاحب؟

(بیڑی پیتے دیکھ کر) ہائیں۔ مدرے میں بیٹھ کر بیڑی پی رہا ہے۔ بجھا بیڑی۔ بجھا (جام بیڑی

Not For Sale

والا ہاتھ پیچھے کر لیتا ہے اور پیٹھ مولوی صاحب کی طرف)

مولوی: اوہ ہو۔ ادب ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب سے بیڑی چھپا رہے ہیں۔ (ہاتھ سے بیڑی چھین کر) آج شاگرد مدرسے میں بیٹھ کر بیڑی پیتے ہیں۔ چپڑا اسی افسروں سے ماچس مانگتے ہیں۔ افسر رشوت لیتے ہیں۔ لیڈر قوم کو دھوکا دیتے ہیں اور لائق شاگرد پوچھتے ہیں ”یہ تنظیم کا گلا کس نے غائب کیا مولوی صاحب“ ارے گلے تو تمہارے غائب ہونے تھے کم بختو۔

(لکھواتے ہوئے) لے دے کے..... ایک یقین محکم رہ گیا ہے..... جس پہ کام چالو ہے..... اگر..... اتحاد اور تنظیم سے..... اب بھی سبق نہ لیا گیا..... تو یہ قوم..... یقین محکم کا بھی..... وہی حشر کر دے گی۔

مشق

- ۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔
 - (۱) مولوی صاحب قرض کیوں واپس نہ کر سکے؟
 - (۲) مولوی صاحب نے اتحاد کے کلوے ہونے کی کیا وجوہات بتائیں؟
 - (۳) مدرسہ تعلیم بالغال کہاں واقع تھا؟
 - (۴) اس اقتباس میں وزیروں پر کیا طعن کیا گیا ہے؟
 - (۵) مولوی صاحب کس محکمہ کے نام درخواست لکھوا رہے تھے؟
- ۲۔ جملے بنائیں۔

مری پتہ نہ تھا۔ رقم نہ کم ہوئی۔ سنیاتیں گریں۔ ازراہ رحمت۔ آسمان سر پر اٹھانا۔

Not For Sale

۳۔ متن کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

(۱) دیکھ..... نے ہتھیار رکھ کر دیے ہیں، ہم بھی رکھ دو۔

(۲) چپڑا سی..... سے ماچس مانگتے ہیں۔

(۳) کوئی چھرا دکھا رہا ہے کوئی..... دکھا رہا ہے۔

(۴) ہے ہے ہے۔ ارے! جملہ کانٹے کو کہا تھا..... کاٹ دیا۔

(۵) مدرسے کو شاگردوں کا..... ہو گیا ہے۔

۴۔ مکالمہ نگاری کی تعریف کیجیے نیز استاد اور شاگرد کے درمیان، بے ہنگم ٹریفک سے پیدا ہونے والے مسائل پر مکالمہ تحریر کریں۔

۵۔ محاورے کی تعریف کریں اور کوئی سے پانچ محاورے لکھیں۔

انشائیہ:

انشائیہ ایک شخصی صنف ادب ہے۔ انشائیہ نگاری کی ذات کو اس صنف میں مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنی ذات کے حوالے سے مختلف اسلوب میں اشیا کے بارے میں اپنا فلسفیانہ نقطہ نظر واضح کرتا جاتا ہے۔

یعنی ”انشائیہ“ ایک داخلی، ذاتی اور ایسی موضوعی (جس کا کوئی موضوع عنوان ہوتا ہے) تحریر ہے جس کا اسلوب اور بیان کسی خارجی مقصد کا تابع (مطیع، فرمانبردار) نہیں بلکہ لکھنے والے کی شخصیت، اس کی زندگی کے مجموعی تصور اور انفرادی احساس کا اظہار ہے۔ عام مضمون نویسی کے برعکس انشائیہ کا لہجہ، سادہ، بے تکلف اور گہریلو ہوتا ہے۔ ایک مغربی نقاد کے مطابق:

”انشائیہ نگاری ذہنی آزادی خیالی کا نام ہے۔“

مرسید کے بعد انشائیہ لکھنے والوں میں حالی، شبلی، آزاد، شرر، سجاد حیدر، بلدرم، نذیر احمد، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مشکور حسین یاد اور وزیر آغا کے نام اہم ہیں۔

ہدایت برائے اساتذہ: اس ڈرامے کو کلاس روم میں سٹیج کروانے کی کوشش کریں۔

Not For Sale

وفات: ۱۹۷۸ء

تسائیت شدہ یہ وہ نئی شہادت ہے جو ہرگز کی دنیا گول ہے، اپنی بطور کے
تسائیت شدہ یہ وہ نئی شہادت ہے جو ہرگز کی دنیا گول ہے، اپنی بطور کے

شیراز اور کنارِ آبِ رُکنا باد و غیرہ

شیراز کا ہوائی اڈہ بس ننھا منسا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیراز کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی اس کی قدامت و عظمت کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ موسم خزاں کا تھا، نہ پھول نہ پات۔ یہ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ شہر ہے جس کے گل و گلزار کی تعریف سبھی کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ امریکن نرسی بھی تھے۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو یہاں کیا ملتا ہے، نہ زبان سے علاقہ، نہ ادب و تہذیب سے نسبت۔ ایک کسمرہ لٹکا یا، میم کو ساتھ لیا، جہاں کی تعریف سنی اُدھر سدھا رلیے۔ ہمارے ساتھ سامان کا کھڑا ک۔ نہ تھا۔ بس سواری کی تلاش تھی۔ ساتھ ہی میکڈونلڈ ایجنسی تھی۔ شیراز اور اصفہان میں (اور جگہ بھی ہوگا) یہی ایجنسی نرسی بیورو کا کام بھی کرتی ہے

اور ہوا بیانی ایران کے ٹکٹ دینے کا بھی۔ ان سے ہوٹل کی بات کرتے کرتے معلوم ہوا کہ اگر شب بھر قیام کرنے کی بجائے ابھی سے ٹیکسی لے کر آغاز کردیں تو تمام مقام دیکھے جاسکتے ہیں۔ مسجد وکیل و حافظ سعدی کے مزار، دروازہ قرآن وغیرہ تو شہری میں ہیں۔ میوزیم بند ہے۔ سوال فقط تخت جمشید کا رہ جاتا ہے جو ساٹھ ستر میل کی مسافت ہے۔ میکڈویل انجینی والوں نے کرائے کا لمبا چوڑا احباب بنایا جو امریکینوں کے حساب سے ٹھیک ہی ہوگا۔ پھر وہ اصرار کر رہے تھے کہ پہلے تخت جمشید جاؤ۔ شہر میں کیا دھڑا ہے۔ ادھر اپنا دل تھا کہ حافظ اور سعدی میں انکا تھا لہذا ہم نے ٹیکسی لی اور سیدھے مزار حافظ کا راستہ لیا کہ وہی پہلے پڑتا تھا۔ حافظ کے احاطے میں دیکھا کہ جاہلوگوں کی ٹولیاں بیٹھی ہیں اور ایک کونے میں کوئی شخص ٹیپ ریکارڈ لیے کوئی پروگرام ریکارڈ کر رہا ہے۔ اونچی کرسی پر مزار ہے لیکن مزار کے گرد کوئی جالی یا پردہ نہیں کہ اندر اطمینان سے بیٹھ کے کوئی فاتحہ پڑھ سکے۔ کہتے ہیں: یہاں قال کے لیے دیوان کا ایک نسخہ رکھا رہتا ہے، ہمیں نظر نہ آیا۔ لڑکے لڑکیاں تفریح کے موڈ میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے دور ہی سے فاتحہ پڑھی اور ٹیکسی والے سے کہا: چلو اب سعدی کے مقبرے۔

مزار شیخ کے احاطے کے پچانک پر ہی یہ شعر رقم تھا:

زخاک سعدی شیراز بوئے عشق آید
ہزار سال پس از مرگ او اگر بوم

احاطے کے اندر داخل ہوتے ہی طبیعت ایک عجیب سرور سے آشنا ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ ذرہ ذرہ دامن کشاں ہے۔ مقبرہ نہایت سادہ ہے اور ایک کاریڈور کے سرے پر بہت مختصر سا گنبد ہے جس کے چار طرف جالیاں، اندر مزار ہے۔ بہت سی عورتیں مزار کو بوسہ دے رہی تھیں۔ معلوم ہوا منتیں بھی مانی جاتی ہیں۔ ایک طرف خدمت گار کھڑا تھا اور کسی عقیدت مند خوشنویس کی لکھی ہوئی گلستان کی ایک حکایت اور بوستان کی ایک نظم دیوار پر آویزاں تھی۔ جب مزار سے عورتیں رخصت ہو گئیں، ہم فاتحہ کے لیے بڑھے۔ لیکن جانے کیا ہوا؟ معاً جی بھر آیا اور ہم نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔ جتنا ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے، سیلاب اور اُمدتا تھا۔ فاتحہ بہت طویل ہو گئی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ حافظ ہماری یہ کیفیت

Not For Sale

دیکھے۔ جانے کتنے عالم آنکھوں کے آگے آئے۔ وہ دن جب ہم نے اپنے گاؤں میں گلستان کے درس کا آغاز کیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ: ”در باب شاہاں“ سے ہمارا درس شروع ہوا تھا اور ”زندہ یست نام فرخ نوشیرواں“ والی حکایت پہلی تھی۔ پھر ”قافلہ دزدان بر سر کوہے نشستہ بودند“ یاد آئی۔ ہم نے سعدی کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دوست سمجھا اور شاید یہ داخلی رفاقت اور دوستی تھی جس سے یہ حال ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا: یہی نواح ہوں گے، جن میں ہمارا شیخ سیر کرتا تھا، گھومتا پھرتا تھا اور پھر لوگ یہاں اس کا جنازہ لائے ہوں گے۔ یہ وہی سعدی ہے، یہ وہی شیراز ہے۔ یعنی وہی پہنائی ہے جس سے بچپن سے غائبانہ آشنائی ہے۔ یقین نہ آتا تھا۔

شیخ کے مزار سے رخصت ہونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُٹھتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ حافظ کے مزار پر قطعاً یہ کیفیت نہ تھی۔ وہاں ہم خالی گئے، خالی آئے۔

یادگار کے لیے ہم نے کیاریوں پر نظر ڈالی۔ صاحب گلستان کے چمن میں گلاب کا کوئی پھول اس وقت نظر نہ آیا۔ ناچار گل صدر برگ کا ایک غنچہ نو شکفتہ لیا اور جیب میں رکھ لیا۔ شیخ کی یہ یادگار ایک متاع عزیز کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

اگلی منزل تھی..... مسجد وکیل

نادر شاہ کے قتل کے بعد شیراز میں کریم خان زند کی حکومت رہی جو اپنی نیک نفسی اور رعایا دوستی کے لیے مشہور تھا۔ اس نے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے سے انکار کیا تھا اور خود کو وکیل الرعایا ہی کہا۔ اس کے عہد میں شیراز کے بھاگ کھلے اور یہ مسجد بھی اس کی یادگار ہے جس کی ٹائیلیں بہت خوبصورت ہیں۔ ساتھ ہی مشہور بازار وکیل ہے۔

وہاں سے ٹیکسی لی اور دروازہ قرآن دیکھا۔ ایک زمانے میں شیراز کے گرد فصیل اور دروازے تھے جن میں فقط یہی باقی ہے۔ اس کا نام قرآن دروازہ اس لیے ہے کہ اس کے اوپر برکت کے لیے قرآن مجید کا ایک ٹکڑا رکھا رہتا تھا جو اب تہران کے عجائب گھر میں ہے۔ اصفہان اور تخت جمشید سے آنے والی شاہراہ اسی دروازے کے نیچے سے گزرتی ہے۔

Not For Sale

ابھی شاید بارہ کا عمل تھا اور تجھے ہمیشہ یاد تھا۔ ہم نے ایک سالم نیکی روکی۔ اس نے پندرہ تومان کہے، ہم نے دس۔ آخر بارہ ملے ہو گئے۔ ڈرائیو رکنا نام منظور تھا اور اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے تھوڑی انگریزی بھی آتی ہے۔ یہ دعویٰ اس کے بہنام منظور کے دعویٰ اتنا الحق سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز تھا، کیونکہ اصل میں اسے صرف ایک لفظ آتا تھا: Yes اور اسے وہ مسلسل اور متواتر استعمال کرنے پر مصر تھا۔ ہم فارسی میں لمبی چوڑی گفتگو کرتے تھے اور وہ Yes کہہ کر فارغ ہو جاتا تھا۔ گفتگو کم و بیش یوں رہی تھی۔

سوال: (فارسی میں) میاں منظور! تم شیراز کے رہنے والے ہو یا باہر کے۔

جواب: Yes

سوال: یہاں سے اصفہان کے کس پر ہے؟

جواب: Yes

سوال: ہمارا جہاز ساڑھے تین بجے روانہ ہوتا ہے یا چار بجے۔

جواب: Yes

آخر ہم نے نہایت عاجزی سے کہا کہ ہم انگریزی نہیں سمجھتے، فارسی میں گفتگو کرو۔

بہر حال انگریزی کیسی بھی ہو، نیکی منظور کی اچھی تھی اور خوب چلتی تھی۔ راستے میں ہم نے پوچھا:

افسوس! رکنا باؤنٹس دیکھا۔ اس وقت ہم ایک ٹالے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ منظور نے کہا: آقا! یہی رکنا باد ہے۔ یہ ایک سوکھا لالہ تھا۔ حافظہ صاحب یہیں سیر کر کے خوش ہو جاتے ہوں گے۔ منظور نے کہا: بہار کے موسم میں آئے اور ہنرے کی بہار دیکھیے۔ یہ موسم شیراز دیکھنے کا نہیں ہے۔ گھائیاں آتی تھیں، گزر جاتی تھیں۔ آخر چچن ساٹھ میل جانے کے بعد افق پر دارا کے محل کے میناروں کی تحریر نظر آئی۔ آخر آگیا نا تخت جمشید۔

ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور دوپ خاصی تیز ہو گئی ہے۔ دارائے اعظم کا شہر عذر سامنے ہے۔

دارائے اعظم کے خرابے اور میناروں کی تحریر نظر آتی ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے یہیں تیسرے دارا اور اسکندر اعظم کی فوجوں کا یہاں سے دوڑا ہوا تھا۔ یہاں جگہ نہایت رہا تھی جہاں اب پتلی کولا کا شال ہے۔ پتلی

کولا تو ایک طرف اس وقت اس غریب کے منہ میں کوئی پانی چوانے والا بھی نہ تھا۔ یہ جو امریکی ایسویٹنس یہاں کھڑی ہے، بہت بعد میں پہنچی اور شیراز کا مشہور نمازی ہسپتال بھی کوئی ڈھائی ہزار سال دیر سے بنا۔

دارا سے بھی ہماری ملاقات پرانی ہے۔ اس زمانے میں ہم سکول کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ اسکندر اعظم کے ہاتھوں دارا کی شکست اور تباہی کا حال پڑھ کر چنداں افسوس نہ ہوا تھا کیونکہ اسکندر اعظم کو ہم مسلمان سمجھتے تھے۔ اسکندر اعظم پر ہی کیا موقوف ہے، جتنے ناموں میں ف، ق، غ، ظ وغیرہ آئیں، وہ ہندو تو بہر حال نہیں ہو سکتے تھے مثلاً: فیلقس، ارسطو، افلاطون، فیثاغورث، سقراط، بطراط اور ان دنوں ہمارے نزدیک تو میں فقط دو تھیں: ہندو اور مسلمان۔ افسوس ہوتا تھا کہ اسکندر دریائے بیاس کے مغربی کنارے سے کیوں لوٹ گیا۔ ہمارا گاؤں بیاس کے مشرق میں کوئی زیادہ دور تھوڑی تھا۔ "اے آمدت باعث آبادی ما۔"

یہ جو چٹانوں کا سلسلہ تخت جمشید کے پس منظر میں نظر آتا ہے، کوہِ رحمت کہلاتا ہے۔ تخت جمشید کو جمشید کیوں کہتے ہیں؟ کوہِ رحمت میں رحمت کی بات ہے اور وہ جو ہم نقشِ رستم دیکھنے جائیں گے اس سے رستم کا کیا تعلق ہے؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہیں کہیں تخت جمشید سے سو سال پہلے سیروس اعظم کا بنا کردہ شہر پازرگاہ تھا اور انہی نواح میں اسطخر کی آبادی تھی۔ اسطخر تو عہد اسلام میں کئی صدیوں تک مشہور رہا۔ اب یہ تینوں شہر محض خرابے ہیں۔

شیراز کا کھانہ کھانے کی نظر کے مقدم

کھنڈرات کی کرسی زمین سے کوئی تیس چالیس فٹ اونچی ہے اور اس پر چڑھنے کے لیے چوڑی سیڑھیوں کا سلسلہ ہے۔ ان سیڑھیوں پر گھوڑے مع سواروں کے ٹاپیں مارتے چڑھتے تھے۔ لیجیے! اب مسطح میدان ہے۔ بہت سے محلوں میں تو میناروں کے فقط ٹھنڈے باقی ہیں لیکن بعض منارے اب بھی آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ دیواریں کئی کئی فٹ تک قائم ہیں اور دروازے تو اکثر جگہ ڈھانے ہزار سال سے یونہی کھڑے ہیں اور ان کی نقوشیں کا جال قائم ہے۔ کہیں شیروں کے مجسمے ہیں، کہیں بیلیوں کے بت۔ یہاں حمام تھا۔ یہاں دیوان خاص تھا۔ اب آپ دھوپ کی پروا نہ کرتے ہوئے چپے چپے، محلوں کی وسعت سے نہ

گھبرائے۔ آخر بنانے والے اپنے زمانے کے جہاں پناہ تھے۔ اس زمانے میں آپ کو کون یہاں گھسنے دیتا۔ وہ تو وہ، ان سیاہیوں کی ہڈیاں بھی گل گئیں جنہوں نے اپنے ناموں کو دوام عطا کرنے کے لیے انہیں مختلف دروازوں اور محرابوں پر بٹھکریوں سے کندہ کر دیا ہے۔ کوئی کتبہ جرمن میں ہے، کوئی فرنگی میں۔ ایک ۱۸۹۶ء کا ہے نیویارک مائٹن کے نام نگار کا۔ ایک کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے، ایک ۱۸۳۶ء کا بھی، جنہوں، چھٹیوں، ایوانوں میں سے گزرتے ہوئے ایک میوزیم میں پہنچتے ہیں۔ چھوٹا سا میوزیم ہے کیونکہ یہاں کے آثار کچھ تہران چلے گئے، کچھ اپنے آبائی کتابوں کی طرح لندن اور پیرس میں۔ تخت جشید کے میوزیم میں زیادہ تر چھوٹے بڑے سٹے سٹیاں ہیں، جلی ہوئی لکڑی کے کچھ ٹکڑے بھی، کیونکہ آخر سارا محل آگ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

تخت جشید میں سب سے رفیع الشان محل تو دارا کا ہے۔ دوسرے نمبر پر اس کے جانشین خرخشاس اول کا صد ستون محل اس کا نام "پادانا" ہے جس کو داریوش (دارا) اول نے شروع کیا اور اس کے بیٹے نے مکمل کیا۔ یاد رہے کہ اسکندر نے لڑتے ہوئے جوشنشاہ مارا گیا، وہ دارا نام کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اسی طرح کئی بہرام ہوئے ہیں اور کئی خرخشاس۔ پادانا کے تیرہ ستون ابھی باقی ہیں اور محل کے مشرقی زینے پر شاہ معظم کی خدمت میں ۲۸ قوموں کے لوگوں کو نذرین لاتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے پہلو میں دارا کا پرائیوٹ محل ہے جو "شکارا" کہلاتا ہے اور اس کے دروازے پر شاہ کے ایک عفریت سے لڑنے اور اس کے سر میں تلوار بھونکنے کی تصویر مرسم ہے۔ بادشاہ کی ذاوچی اور کپڑوں میں جواہر نکتے تھے، اب فقط سوراخ باقی ہیں۔ اس طرح ایک نجی محل خرخشاس اول کا بھی۔ پھر ایک ملکہ کا محل، جس میں خدام اور لونڈیوں کے لیے حجرے ہیں۔ جو عمارت میوزیم کی ہے وہ پہلے استقبال کا تھی۔

نقش رستم، تخت جشید سے چار چھ میل آگے ہے۔ ہم نے جی میں سوچ لیا تھا کہ وہاں جانے کے دو چار تومان ڈرائیور کو اور دے دیں گے۔ ہم نے کہا: میاں منصور! چلو نقش رستم کے نقش تو سڑک پر ہی سے نظر آجاتے ہیں، باقی رہے دیوار میں بنے ہوئے حجروں میں تابوت، ان کے دیکھنے میں پانچ دس منٹ لگیں گے۔ ان حجروں کے دہانے سڑک سے کوئی سو فٹ سے زیادہ اونچائی پر ہوں گے۔ پرانی تحریروں کے

میں کس خیال میں ہوں اور آسان کس خیال میں ہے۔

مطابق وہاں تک رسوں سے چڑھتے تھے۔ تابوت بھی یونہی کھینچے گئے تھے۔ اب ایک تنگ گول زینہ لوہے کا لگا دیا گیا ہے۔ ان مقبروں اور تابوتوں کا حصہ بہت تنگ و تاریک ہے۔ پہاڑ کو اندر سے کھود کر بنایا گیا ہے۔ باہر سڑک کے رخ کی تصویریں اور کتبے ساسانی بادشاہ اردشیر کے ہیں، یعنی تیسری صدی عیسوی کے۔ ایک جگہ بہرام دربار لگائے ہوئے ہے۔ ان تابوتوں میں ایک تو داریوش اول کا بیان کیا جاتا ہے، دوسرے کے متعلق قیاسات اور اختلافات ہیں۔

لیجے صاحب! جو شہر صدیوں میں بے اور اسکندر کو آکر ڈھانے پڑے، ہم نے ڈھانکی گھٹنے میں دیکھ لیے۔ اب پھر ہم تھے اور شیرازی کی سڑک، جس پر منصور کی ٹیکسی ساٹھ میل کی رفتار سے فرائے بھرتی جا رہی تھی۔ ہم نے اپنے جی بی جی میں حساب جوڑا، بارہ تومان تخت جشید تک اور جیسا کہ رستے میں طے ہو گیا تھا۔ دس تومان واپسی کے، کل ۲۲۔ نقش رستم تک جانے کے دو تین چار پانچ سمجھ لیجیے۔ شہر سے ہوائی اڈا دور نہیں۔ دو تین اس کے بھی، گویا تیس تومان۔ چلیے! منصور بھی خوش ہو جائے گا، لیکن:

من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال

تخت جشید سے واپسی پر شیرازی کی سڑک پر فرائے بھرتے ہوئے حافظ سعدی کے ذکر لطیف میں بات سے بات نکالتے ہوئے منصور نے کہا: "آپ مجھے کتنے پیسے دیں گے؟"

ہم نے کہا: "برادر بھان برابر! کوئی بے اعتباری ہے کیا؟ تمہیں خوش کر دیں گے۔" بولے: "نہیں! یہ بات نہیں، یہ ٹیکسی ہی آپ کی ہے۔ آئندہ جب کبھی جناب عالی شیراز تشریف لائیں تو اس خانہ زاد منصور کو یاد رکھیں۔ اس ناچیز کے ہوتے کسی اور سے آپ خدمت لیں گے تو میرا دل توڑیں گے۔" ہم نے کہا: "واہ! یہ کبھی ہو سکتا ہے؟"

انیر پورٹ پر پہنچ کر ہم نے بائیس یا پچیس کی بجائے جو ان کا حق ہوتا تھا، تیس تومان منصور صاحب کی مٹھی میں دے دیے۔

بولے: "یہ کیا؟ یہ تیس ہیں، اتنے تو میں نہیں لوں گا۔"

مشق

- ۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔
 - (ا) مصنف حنفی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟
 - (ب) حافظ کے مزار پر ان کے دیوان کا نسخہ کیوں رکھا جاتا تھا؟
 - (ج) شیخ سعدی کے مزار پر مصنف کی کیا کیفیت ہوئی؟
 - (د) ڈرائیور منصور کی انگریزی کے بارے میں مصنف نے کیا مثال پیش کی؟
 - (ه) دارا اور سکندر کون تھے؟
 - (و) ڈرائیور منصور اور مصنف کے درمیان کرائے کا کیا معاملہ پیش آیا؟
- ۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

- (ا) نذہبان سے علاقہ، نادب و تہذیب سے نسبت، ایک کسمرہ لکایا، ہم کو ساتھ لیا، جہاں کی تعریف سنی اُدھر سدھارے۔
- (ب) ہم نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے، تو آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا، جتنا ضبط کی کوشش کرتے تھے، سیلاب اور اڑتا تھا۔
- (ج) ان سے فریاد یا استغاثہ کیا کرتے؟ منصور ہم سے اچھی اور تیز فاری بولتا تھا، ممکن ہے ہم مقدمہ جیت بھی جاتے، لیکن اصفہان کا جہاز ضرور چھوٹ جاتا۔
- (د) یہاں کے آثار کچھ تھران چلے گئے، کچھ اپنے آپ کی کتابوں کی طرح لندن اور پیرس میں۔
- (ه) اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے تھوڑی انگریزی بھی آتی ہے۔ یہ دعویٰ اس کے ہم نام منصور کے دعوے انا الحق سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز تھا۔

۳۔ امدادی فعل کی تعریف کریں اور مثالیں دیں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ مفہوم واضح ہو جائے۔

قدامت و عظمت، غنودگی، دیوان خاص، رفیع الشان، عفریت، خاندان، بھلائی۔

۵۔ سفر نامے کی تعریف کریں اور اس کے فنی لوازمات لکھیں۔

ہم نے کہا: ”لے لو، لے لو، ہم کوئی بطور بخشش یا انعام تھوڑا ہی زیادہ دے رہے ہیں، ان پانچ تومان کو ہمارا دوستانہ نذرانہ سمجھ کر قبول کرو۔ تکلف نہیں کیا کرتے۔“

لیکن منصور صاحب ناک بھوں چڑھا کر بولے: ”جناب! پینتیس سے ایک تومان کم نہ لوں گا۔“

”پینتیس؟ وہ کیسے؟“ ہم نے پوچھا۔ ”۱۰+۱۲ تو ۲۲ بنے، تھوڑا اوپر لگا لو۔ ۲۵ ہو گئے چلو! ۲ اور سبکی، لیکن ۳۵ کیسے؟“

بہت سی فاری بول کر فرمایا: ”ساب کو چھوڑیے پینتیس ہی ہوتے ہیں۔“ ہم ٹیکسی سے نکل چکے تھے لیکن وہ بھلا مانس جو تھوڑی دیر پہلے تک خانہ زاد بننا تھا، رست روک کر کھڑا ہو گیا۔ ”جناب! پینتیس دیجیے پینتیس۔“

اب ہوائی اڈے کے حمال اور دوسرے بے فکرے تماشاخی آن جمع ہوئے۔ ان سے فریاد یا استغاثہ کیا کرتے۔ منصور ہم سے اچھی اور تیز فاری بولتا تھا۔ ممکن ہے ہم مقدمہ جیت بھی جاتے، لیکن اصفہان کا جہاز ضرور چھوٹ جاتا۔

پس ہم نے کہا: ”لومیوں! ۳۵ تومان۔ قربانت شوم! تم تو کہتے تھے ٹیکسی آپ کی ہے۔“

منصور نے نہ ہمارے سلام کا جواب دیا نہ کوئی اور بات کی۔ ٹیکسی لے یہ جاوہ جا۔

(ابن بطوطہ کے تعاقب میں)

جمیل الدین عالی



وفات: ۲۰۱۵ء

پیدائش: ۱۹۲۶ء

ملی نغمہ ”جیسے جیسے پاکستان“ کے خالق جمیل الدین عالی دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی سے بی اے کرنے کے بعد عملی زندگی کا آغاز وزارت تجارت میں اسٹنٹ کی حیثیت سے کیا۔ بعد میں مقابلے کا امتحان پاس کیا اور انکم ٹیکس افسر مقرر ہوئے۔ ایوان صدر میں بھی بطور افسر بکار خاص خدمات سرانجام دیں۔ وزارت تعلیم سے بھی منسلک رہے۔ کاپی رائٹ رجسٹرار اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے سیکرٹری بھی رہے۔ ۱۹۶۱ء میں یونیسکو کی فیلوشپ ملنے کے بعد مختلف ممالک کی سیاحت کی۔ پاکستانی مندوب کی حیثیت سے بھی کئی ممالک کے دورے کیے۔ رائٹرز گلڈ کے قیام کے بعد اس کے اعزازی مرکزی سیکرٹری اور سیکرٹری جنرل بھی رہے۔ انجمن ترقی اردو کے مرکزی رکن اور معتد اعزازی رہ چکے ہیں۔ روزنامہ جنگ میں ان کا کالم باقاعدگی سے چھپتا رہا ہے۔

ان کے سفرناموں کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں: ”جمیل الدین عالی نے تماشائے آگے اور دنیا میرے آگے“ میں سفر کے فوری تاثر کو اخباری کالم میں سمیٹ لیا۔ انھوں نے ادب کے کلاسیکی پس منظر کو زندگی کے موجودہ مناظر سے مربوط کیا۔ ان سفرناموں میں مصنف خود مگر خدا و خداوند خودی بن کر ظاہر ہوتا اور شرقی درویشی کا بھرم قائم رکھتا ہے۔“

تصانیف: اے میرے دست بخشنے والا، خدا کر چلے، خدا کر چلے، انسان، لاحاصل، تماشائے آگے اور دنیا میرے آگے وغیرہ

Not For Sale

94

جمیل الدین عالی

روم: زندہ شہر اور مردہ شہر

”اگر آپ نے رومی پڑھا نہیں کھایا تو کچھ نہیں کھایا“۔ اطالوی سینورینا، مالک ہوٹل ووڈ کاک نے فرمایا۔ میں دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ ہمیں پڑھا کھلائیں گی۔ ارے مائی! اپنا تو کچھ ہی پڑھا کچھ ہے، مگر اطالوی پڑھا تو غضب کا نکلا۔ اس کا اصل نام ہے پیتسا (پلیٹ سا) جو انگریزی میں پیزا (Pizza) بولا جاتا ہے۔ میدہ گوندھ کر یہ چوڑی نان بنائی، پھر انڈاملا، ٹماٹر لپیا، پیاز پوتی، ادراک، کالی مرچ نمک، پسا ہوا گوشت چھڑکا اور تندور میں رکھ دیا۔ کچھ تندور بجلی کے ہوتے ہیں، کچھ اصلی تے وڈے پاکستانی تندور ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہوئے تندور، جو آن کی آن میں پختی کو کند بن سکتے ہیں۔

اب اس آج پختہ ہو کر جو رومی پڑھا یا پیتسا نکلتا ہے، اسے اسی وقت کھا لیجیے۔ زبان ذرا سی جلے گی، مگر وہ مزائی کیا جس میں جلنا نہ پڑے۔ ٹھنڈا ہوا اور سارا مزہ فوراً ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے آٹے میں لٹی ملا کر کھا رہے ہیں، کیونکہ انڈے، گوشت، ٹماٹر سب ٹھنڈے ہو کر ہمواری اور یکسانیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاں! اتنا ضرور ہے، پیتسا کو بار بار گرم کر کے کھایا جاسکتا ہے۔

پیتسا اٹلی کی سب سے سستی اور بقول کے گھڑی غذا ہے۔ ایک پڑھا بمشکل کھایا جاتا ہے۔ اپنے جیسوں کا پیٹ آدھے میں بھر جاتا ہے۔ اس لیے قیمتیں بھی ٹکڑوں کے حساب سے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پورا پڑھا مول لیا جائے، پونا بلکہ پاؤ بھی ملتا ہے۔ امرا اسے اضافی ڈش کے طور پر کھاتے ہیں، جیسے ہمارے امرا کے دسترخوان پر کئی کئی کھانے ہوتے ہیں اور پتا نہیں چلتا کہ:

کیا چیز ہے بنیادی

اور یہ ایسا گیتی ہے، ایسے پاگے تھے، جسے یہاں کے انگریزی دان اسپاگھٹی (Spaghetti) وغیرہ

Not For Sale

95

کہتے ہیں۔ حالانکہ سویاں کہہ سکتے ہیں۔ موٹی موٹی، لمبی ہوتی ہیں کہ روم سے کراچی تک بحری تار کا سلسلہ قائم کرنے میں کام آئے۔ چچے، کاٹے، چھری، تینوں کی مدد سے کھانا پڑتا ہے۔ ہلکے مکھن کے سالن میں سیر سیر بھر، موٹی موٹی، لمبی لمبی سویاں ایک بڑا سا پیتا اور آس پاس نہایت اطمینان سے لپ لپ کھاتے ہوئے ماہرین، جو کن انکیوں سے میری بے بسی کو دیکھتے جاتے ہیں

اطالوی لُچ کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے ہیں۔ یورپ کے انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے یہ ملک یورپیوں کے بقول: ”گرم ہے“۔ میدے کا کھانا کھا کر یوں بھی نیند آتی ہے۔ چنانچہ ایک بچے دو پہر سے چار بجے سہ پہر تک کاروبار تقریباً بند رہتا ہے۔ لُچ نام چار بجے ختم ہوتا ہے تو یار لوگ دودو گھنٹے اور کام کرتے ہیں، مگر ان دو گھنٹوں میں بھی پندرہ منٹ چائے کے وقفے کے نام پر آدھ پون گھنٹے گپ اور آرام فرماتے ہیں۔

جیسے جیسے اوقات دفتر ختم ہوئے اور:

پھر موج ہوا بچیاں اے میر نظر آئی

مگر میں ابھی اس موج کے بچوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوا۔ اکیلا آدمی کب تک گھوے، کہاں کہاں گھوے اور سب سے بڑی دقت: زبان یا رجوڑ کی ہے، اس کا کیا علاج۔ ”دودن میں اطالوی سیکھ“۔ بار بار پڑھی، بلکہ ہر وقت جیب میں رہتی ہے مگر کچھ خاص کام نہیں آتی۔ چنانچہ میں نے اپنا پڑاؤ ایک ٹیل پر لگایا ہے جو میری طرح تباہی ہے اور ہنگامہ پرور بھی۔ تباہیوں کہ اکیلا ہے، ایک ہے اور بے جان ہے۔ ہنگامہ پروریوں کہ اس کے آس پاس بہت سے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ قدیم روما کا سب سے مشہور ٹیل ہے۔ انگریزی میں اس کا نام وی انگریزی قسم کا ہے، یعنی ٹائبرینک۔ جب عیسائیت نے زور پکڑا تو اس کا نام سینٹ انجلو کا ٹیل رکھ دیا گیا کیونکہ اس کے پیچھے سینٹ انجلو کے نام سے ایک عظیم الشان قلعہ بنا ہوا ہے۔ مگر اصل میں ایسے مقامات کے نام کوئی نہیں ہوتے جیسے دنیا کو کوئی نام نہیں ہے، زندگی کا کوئی نام نہیں ہے۔

میں تقریباً روزیہاں آتا ہوں اور یہ جو اُلے ہاتھ کو دریا کے کنارے دیوار بنی ہوئی ہے، اس پر دریا کی طرف پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پیچھے درختوں کا سایہ ہے جو دھوپ کی شدت سے محفوظ رکھتے ہیں۔ سامنے

وے رے ہے جو ماضی کا بائیسکوپ دکھاتا ہے۔

اس جگہ کا نام ہے: کپیٹول (کے پی ٹول)۔ یہی نام آپ نے امریکی صدر مقام واشنگٹن کے سلسلے میں بار بار سنا ہوگا۔ وہاں کپیٹول نامی ایک گنبد والی عمارت ہے جہاں امریکی مقننہ یعنی سینٹ یعنی سنات بیٹھتی ہے۔ بقول امریکیوں کے: آج دنیا کا سب سے اہم مقام کپیٹول ہے۔ یہ لفظ بھی سنات کی طرح اٹلی سے امریکہ لے جایا گیا ہے۔ بہر حال ہم کو اس سے کیا غرض کہ کون کہاں سے کیا لے گیا ہے اور پھر اسے کس طرح اپنایا؟ خود ہماری ہزار ہا کتابیں لندن کے کتب خانوں میں مقید ہیں جن کے ٹیل پر یورپین مستشرقین آج تک مشرقی علوم میں اپنی مہارت کی دھونس بھجواتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے یا شاید معلوم نہیں کہ روم سات پہاڑوں پر بنا ہوا ہے۔ اب وہ پہاڑیاں سڑکوں کے اتار چڑھاؤں میں بدل گئی ہیں اور کہیں کہیں محسوس ہو جاتا ہے کہ: ہاں! ”روم ایک دن میں نہیں بنا“۔ یہ عمارت بھی ان سات میں سے ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یہ سیاسی اور مذہبی مرکز کا درجہ رکھتی تھی۔ اب سیاحوں کی زیارت گاہ ہے۔ اس جگہ سے بڑی بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ ایک رومی حاکم نائرس گرا جس ۱۳۳۳ قبل مسیح میں اسی مقام پر قتل کئے گئے تھے۔ یہ سامنے مندر ہے۔ مندر یا عبادت گاہیں، ان کے ذریعے ملاحظہ کیجیے۔ یہ سب اس وقت بنے ہیں جب رومۃ الکبریٰ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ زوال پذیر قوم اپنے عروج کو نہ بھولی اور عروج حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہوتے اس کی یادگاریں قائم ہوتی گئیں۔ کپیٹول قدیم رومۃ الکبریٰ کی نشانی نہیں، بلکہ ان جمہوری روایات کی یادگار ہے جو قدیم رومنوں نے قائم کی تھیں۔ سنہ پندرہ سوئیس میں اس کے حصار ٹوٹ گئے تھے اور مدتوں یہ بے ترتیب پڑی رہی۔ یہاں تک کہ مشہور مصور اور معمار مائیکل انجلو نے اس کی ترتیب نو اور تزئین کا منصوبہ بنایا۔

آپ روم سے اُکتا گئے ہوں گے، میں نہیں اُکتایا، بلکہ ابھی تو اصلی یعنی پرانا روم شروع ہی نہیں ہوا۔ لیکن چلیے ذرا روم سے باہر بھی ہوائیں کیونکہ اٹلی صرف روم ہی نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی درست ہے۔ کم از کم ہمارے لیے اٹلی روم کے بغیر کچھ نہیں۔

اب آدمی روم سے پہلے کہاں جائے۔ ویش خوب صورت اور قدیم شہر ہے جو پانی پر بنا ہوا ہے۔ یعنی جس کے گرد پانی ہے جہاں سڑکیں نہیں ہیں بلکہ سڑکوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی نہریں ہیں۔ یا نیپلز، وہ بندرگاہ جس کے بارے میں ملاح اور سیاح طرح طرح کی کہانیاں ساتھ لاتے ہیں۔ یا سسلی چلیے گا۔ سسلی جس کا عربی نام "صقلیہ" ہے۔ جزیرہ صقلیہ جہاں پہاڑوں کے بیچ قدرت نے نیلے نیلے چشمے بنا رکھے ہیں اور جو سیاحوں کی جنت کہلاتا ہے۔ شاید آپ "میلان" جانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ وہ ایک صنعتی شہر ہے جو جدید ہے اور اٹلی کا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے۔ یوں بھی وہ شمال میں ہے اور اطالوی تاریخ اور حسن کے خزانے جنوب مغرب میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یہ پوہی ای ہے جسے انگریزی دان پوہی آئی کہتے ہیں۔ پوہی آئی نیپلز کے ساتھ ہے، بلکہ نیپلز میں ہے۔ لیکن:

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یہ ایک عظیم اور خوشحال شہر تھا، جو اڑ چکا ہے، بکھر چکا ہے، ختم ہو چکا ہے اور شاید ابھی زندہ ہے۔ کئی سو برس ہوئے جب ایک قبر خد اوندی نازل ہوا، ایک زلزلہ آیا اور پورا شہر زیر زمین چلا گیا۔ پوہی آئی، جسے دیکھنے یورپ ہی نہیں ایشیا تک زائریں جوق در جوق آتے تھے، لمحے بھر میں ختم ہو گئے۔ اس کے مکان کھنڈر بن گئے اور کین کھنڈروں میں دفن ہو گئے۔

مجھے یہاں بابل کے کھنڈر یاد نہیں آئے۔ ان کی عظمت زیر زمین نہیں گئی تھی، بلکہ ان کو آسمان کھا گیا تھا۔ لیکن پوہی آئی کو زمین نے ہضم کیا اور اس طرح کہ آج تک ہزاروں ماہرین آثار قدیمہ کی کوشش کے باوجود پورے شہر کو اٹھنے پر تیار نہیں ہے۔

نچو! دوستو! بزرگو! افسرو! حاکمو! اللہ کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ کھنڈر جو بائیں ہاتھ کو چلے گئے ہیں، نہ جانے کن کن امراء عظام کے مسکن ہوں گے۔ انہی مخلوق میں ہائی پالیکس بھی ہوتی تھی۔ شہزادے، وزراء، فوجی افسر ایک دوسرے کے موافق اور خلاف سازشیں کرتے تھے، پرمٹ بانٹتے تھے، عہدے تقسیم کرتے

Not For Sale

تھے، بادشاہوں کو بنانے اور بگاڑنے کے چکر میں مبتلا رہتے تھے۔

اور اب وہ سب کھنڈر ہیں، خاک ہیں، خاک اور پتھر، جن کا عام اور مشہور نام، عبرت ہے اور جسے میں اس کی عمومیت کے باوجود بار بار دہراتا ہوں، مگر سننے والے نہیں سنتے، سمجھنے والے نہیں سمجھتے، اور اگر سمجھتے ہیں تو خدا سے ڈرنے کی بجائے غصے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ تو آپ نے بھی سنا ہے کہ غصے سے نزلہ پیدا ہوتا ہے اور نزلے کے بارے میں سب حکیم ڈاکٹر جانتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی پر گر کر رہتا ہے۔

چنانچہ پوہی آئی سے جلد باہر نکل جائیے مبادا آپ کو عبرت کی بجائے غصہ آجائے، جس سے نزلہ پیدا ہو کر کسی عضو ضعیف پر گر جائے۔ کچھ ہی مدت بعد نہ آپ رہیں گے نہ آپ کا غصہ، نہ آپ کا نزلہ، نہ عضو ضعیف، بلکہ سب پوہی آئی بن جائیں گے، سب کھنڈر ہو کر رہ جائیں گے، سب کا نام بدل جائے گا اور سب کو ایک ہی نام سے یاد کیا جائے گا اور نام وہی پُرانا نام ہے، تاریخ!

(دنیا میرے آگے)

مشق

۱۔ سوالات کے جوابات لکھیں۔

(ا) مصنف نے کن کن اطالوی کھانوں کا ذکر کیا ہے؟

(ب) بیڑا کیسے تیار کیا جاتا ہے؟

(ج) اطالوی کھانے کے بعد قیلولہ کیوں کرتے ہیں؟

(د) مائیکل انجلو کون تھا؟

(ه) اس سفر نامے میں جن اطالوی شہروں کا ذکر ہے ان کے نام لکھیں۔

(و) پوہی آئی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

Not For Sale

۲۔ متن کی مدد سے خالی جگہیں پُر کریں۔

- (۱) اطالوی پراسٹے کا نام _____ ہے۔
 (۲) رومن پارلیمنٹ کو انگریزی میں _____ کہتے ہیں۔
 (۳) سامنے تے دے رہے ہے جو ماضی کا _____ دکھاتی ہے۔
 (۴) زبان یا رمن _____
 (۵) میلان ایک _____ شہر ہے۔
 (۶) سسلی کا عربی نام _____ ہے۔
 (۷) پانی پر بنا ہوا ایک قدیم شہر ہے۔ _____
 (۸) نزلہ ہمیشہ _____ پر گر رہا ہے۔

۳۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۴۔ اپنے کسی سفر کی زوڑاؤں مختلف چیزائے میں بیان کریں۔

سفر نامہ:

سفر نامہ نگاری دنیا کے تقریباً ہر ادب کی ایک مستقل صنف رہی ہے۔ جب کوئی ادیب سفر کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ خواہ وہ سفر اندرون ملک ہو یا بیرون ملک اور وہ اپنے سفر کے تمام احوال قلمبند کرے تو ایسی تحریر کو ”سفر نامہ“ کہتے ہیں۔ سفر نامے میں وہ کسی خطے یا کسی ملک کی تاریخ بھی شامل کرتا ہے اور اس کا جغرافیہ بھی، وہاں کی تہذیب و تمدن بھی اور اس جگہ کے معاشی و معاشرتی حالات کی جھلکیاں بھی۔ ان تمام باتوں کو دلچسپ اور پر لطف بنانے کے لیے سفر نامہ نگار اس میں کہانی کا عنصر شامل کر دیتا ہے۔ یعنی سفر نامہ نگار انسانی دنیا کی سیر کے دوران تخیل (تعبیر، حیرت) اور تجسس (Suspense) کے جن مراحل سے گزرتا ہے۔ انھیں انسانی رنگ دے کر اپنے سفر نامے کو قاری کے لیے دلچسپ اور معلوماتی افزا بنا دیتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سفر نامہ کسی ملک کی جغرافیائی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کی ایک دلچسپ اور مستند تاریخ ہوتی ہے۔ اردو زبان کا پہلا سفر نامہ نگار یوسف حلیم خان کسلی پوش ہے۔

Not For Sale

(ترجمہ بشیر احمد بلوچ)

لپچی وزیر

لوک کہانیاں عوام کے خیالات و جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ لوک کہانیاں تحریری شکل میں نہیں ہوتیں بلکہ سینہ بہ سینہ اور نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔ مختلف معاشروں، خطوں اور علاقوں کے سماجی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی کہانی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں رائج ہو۔

لوک کہانیوں میں مذہبی اور دینی عقائد کی بجائے خوش اعتقادی اور ضعیف اعتقادی کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ لوک کہانی کے ذریعے کسی بھی مخصوص علاقے یا خطے میں بسنے والے لوگوں کے رسم و رواج، طور طریقے، زندگی گزارنے کے ڈھنگ اور ثقافتی اقدار و روایات کا اظہار ہوتا ہے۔ شامل نصاب کہانی بشیر احمد بلوچ کی مرتب کردہ کتاب ”بلوچی لوک کہانیاں“ سے لی گئی ہے۔ اس کہانی کا اسلوب سادہ اور عوامی ہے۔ اور یہی اسلوب کسی لوک کہانی کا خاصہ ہوتا ہے۔

ایک بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ ملک میں سب سے خراب چیز کل صبح مجھے لا دو۔ وزیر اپنے گھر آیا تو سوچ سوچ کر کافی پریشان ہو گیا کہ معلوم نہیں، سب سے خراب چیز کون سی ہے؟ بادشاہ تو کل مجھے مار ڈالیں گے۔ وزیر اسی غم میں شہر سے بھاگ نکلا اور ایک ویرانے میں پہنچ گیا۔ اس نے بکریوں کا ریوڑ دیکھا۔ گڈریا اس کے ساتھ ہے اور کوئی نہیں۔

وزیر نے دیکھا کہ ساری بکریوں کے گلے میں سونے کی گھنٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ وزیر نے گڈریے سے پوچھا کہ تمہاری بکریوں کے گلے میں کیا پڑا ہوا ہے؟

Not For Sale

گڈریے نے جواب دیا کہ بکریوں کے گلے میں پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ وزیر نے پوچھا یہ پتھر کہاں سے ملے گا۔ مجھے وہ جگہ بتاؤ۔

گڈریے نے کہا: رات کو میرے ساتھ چلو۔ جب صبح ہوگی تو میں وہ پہاڑ تمہیں بتاؤں گا۔ وزیر گڈریے کے ساتھ ہوا۔ رات ہوگئی۔ گڈریے کے گھر میں ٹھہرا۔ گڈریا اپنی بکریوں کے پاس ہی سو گیا۔ آجی رات کو جب وزیر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ گڈریا بیٹھا کچھ پڑھ رہا ہے۔ وزیر اٹھ کر گڈریے کے پاس آگیا۔ اُس نے دیکھا کہ گڈریے کے سامنے ایک بکری سو رہی ہے اور گڈریا کہہ رہا ہے: سبحان اللہ.....

گڈریا وظیفہ پڑھتا رہا اور رات ختم ہوگئی۔ صبح ہوا کرتے کے بعد وزیر نے کہا: اب وہ پہاڑ مجھے دکھاؤ۔ مجھے ضروری جانا ہے۔ گڈریے نے کہا: آج میں اُس طرف نہیں جاسکتا، تم آج یہیں بیٹھے رہو۔

وزیر نے گڈریے سے کہا: اچھا تو تم مجھے بکریوں کے گلے سے کچھ اتار کر دے دو اور بعد میں دوسرے پتھر لا کر ان کے گلے میں ڈال دو۔

گڈریے نے کہا: میں اپنی بکریوں کا دودھ جس برتن میں گتے کو پلاتا ہوں۔ تم بھی دودھ اُس برتن میں پیو، جس طرح شہنشاہیتا ہے۔ پھر میں بکریوں کے گلے سے پتھر اتار کر تمہیں دے دوں گا۔ گڈریے نے گتے والے گندے برتن میں دودھ لیا، پھر اس نے وزیر سے پوچھا: تم ہو کون؟ وزیر نے بادشاہ کا نام لے کر ساری بات بتائی کہ بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سب سے خراب چیز میرے پاس لاؤ۔ اب مجھے پتا نہیں کہ سب سے خراب چیز کون سی ہوتی ہے؟ میں نے سوچا سونالے کر بادشاہ کے پاس جاؤں گا تو وہ خوش ہو جائے گا۔

گڈریے نے کہا کہ سونا تو میں تمہیں بہت دکھاؤں گا۔ اس طرح تمہیں سونے کا پہاڑ دکھائی نہیں دے گا۔ تم کتے کی طرح کھاؤ پو، پھر تمہاری آنکھوں کے سامنے پردہ ہٹ جائے گا اور تم دیکھو گے کہ یہ پہاڑ سب سونے کے ہیں۔ وزیر کتے کی طرح دودھ پینے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اپنے گتے تہہ کر کے دوڑا تو ہو کر بیٹھ گیا تو گڈریے نے اُسے دھکا دیا کہ ہٹ جاؤ، ابھی تک تمہیں پتا نہیں چلا کہ سب سے خراب چیز کون سی ہے؟ ”لاچ“ سب سے خراب چیز ہے۔ سب کو غور کر دیتی ہے۔ تم نے بھی لاچ میں آکر اپنا حال دیکھا۔

وزیر واپس بادشاہ کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ سب چیزوں سے بُری لاچ ہے۔ بادشاہ نے قبول کر لیا۔

Not For Sale

مشق

- ۱۔ مختصر جواب لکھیں۔
۱۔ لوگ کہانی کی تعریف کریں۔
۲۔ لوگ کہانی پر کون سے عناصر اور عوامل اثر انداز ہوتے ہیں؟
۳۔ بادشاہ نے وزیر سے کیا فرمائش کی؟
۴۔ وزیر نے ویرانے میں کیا دیکھا؟
۵۔ سونے کا پہاڑ دکھانے کے لیے گڈریے نے کیا شرط پیش کی؟
۶۔ گڈریے کے مطابق لاچ انسان کو کس حد تک گرا دیتی ہے؟
۷۔ گڈریے اور وزیر کے درمیان ہونے والی گفتگو اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔
۸۔ قواعد کے مطابق جملے درست کریں۔
۱۔ وزیر تیار ہو گیا، گتے کی طرح دودھ پینے کے لیے۔
۲۔ دنیا کی سب سے بُری چیز ہے لاچ۔
۳۔ وزیر کی جب آنکھ کھلی آجی رات کو۔
۴۔ گڈریے نے دودھ لیا، گتے والے گندے برتن میں۔
۵۔ وہ دوڑا تو ہو کر اپنے گتے تہہ کر کے بیٹھ گیا۔
۶۔ درج ذیل اقتباس کا خلاصہ لکھیں۔ جو اصل عبارت کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔

آخر میں نے بھی بے حیائی کا جامہ پہن لیا۔ پنا قسمت میں لکھا ہے تو یوں ہی تھی۔ یوں بھی پٹنا، دوں بھی پٹنا، پھر کام کر کے اپنے آپ کو مفت میں کیوں تھکائیں۔ کتے کا خطاب ملتا ہے۔ تو ملنے دو۔ برا بھلا کہتے ہیں تو کہنے دو۔ اس کا سنو اس کا ان اڑا دو۔ آپ ہی بک بک کر تھک جائیں گے۔ یہ چال بھی گھورنے کی طرح کامیاب ہوئی۔ سب جینے چلائے مگر میں شس سے س نہ ہوتا۔ جہاں کسی نے ذرا تھکا دیا اور میں نے اس زور سے چیخ ماری گویا کسی نے گھاگھونٹ دیا ہے۔ کبھی کسی نے میری اس ترکیب کو دیکھ لیا تو راز کھل گیا، نہیں تو مارنے والا خود گھبرا گیا۔ دوسروں نے غل چلایا، کراسے ہے، الوٹے کو مار ڈالا۔ کبھی تو مارنے والے صاحب مجھ سے زیادہ پٹ گئے اور کبھی ڈانٹ ہوگئی۔ مگر ہم کام سے بچ گئے۔ مگر بابا ”ہر فرعون نے رام کوئی“ چھوٹی صاحب زادی صاحبہ کچھ مجھ سے زیادہ تیز تھیں۔ خود ہی مجھے ماتیں اور خود ہی رونے بیٹھ جاتیں۔ بھلا ان کے مقابلے میں مجھ پھارے کی کیا ہستی تھی۔ اٹنی مجھ پر ہی لے دے ہوتی، غرض اس لڑکی کے ہاتھوں ناک میں دم آگیا۔ مگر میں بھی بدلہ لیے بغیر تھوڑا ہی مانتا تھا۔ مارنے کی تو ہمت نہ ہوتی تھی ہاں کبھی بیگم صاحبہ ان پر خفا ہوتیں، تو میں بھی اٹنی سیدھی بہت کچھ لگاتا۔ بیگم بہینہ پھر پہلے کی باتیں یاد دلاتا۔ اگر قسمت نے یاد دہی کی تو کام بن گیا اور صاحبہ زادی صاحبہ کی خوب کندہ ہوگئی۔ نہیں تو لڑا اچھا لڑا ام لگا۔ بیگم صاحبہ نے بیٹی کا غصہ مجھ غریب پر اتار لیا۔

مکتوب نگاری

ہم روزانہ اپنے دوست احباب، رشتہ داروں، سرکاری و غیر سرکاری افسران وغیرہ سے حسب خواہش و ضرورت بات چیت کرتے ہیں۔ اگر یہی لوگ ہم سے دور ہوں تو ہم اپنی باتیں انھیں کاغذ پر لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح اپنی گفتگو اور بات چیت کو لکھ کر بھیجنا خطوط نویسی یا مکتوب نویسی کہلاتا ہے۔ خط کو ”نصف ملاقات“ بھی کہتے ہیں کیوں کہ وہ باتیں جو ہم آنے سے نہیں کر سکتے، وہ خط کے ذریعے کی جاسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے خط کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔

خطوط نویسی کی تین اقسام ہیں۔ ان میں فنی (رسمی و دعوتی خطوط)، کاروباری اور سرکاری یا دفتری خطوط شامل ہیں۔ مصنف نثر کے لحاظ سے ادبی اور علمی خطوط بڑے اہم ہوتے ہیں۔ مکتوب نگاری بھی اصل میں عربی و فارسی ہی کے ذریعے اردو میں منتقل ہوئی۔ اردو کے ابتدائی دور کی خطوط نویسی کے دور پر نظر ڈالنے سے بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ اردو کس قدر پُر تکلف عبارات، لمبے چوڑے القابات، بناوٹی اور ثقیل الفاظ سے مزین تھی۔ مگر سب سے پہلے مرزا غالب نے فرسودہ اور پرانے طرز آداب و القاب سے گریز کیا۔ سیدھی سادی زبان میں مکتوب الیہ کو خطاب کیا۔ غالب نے نئی وضع اختیار کرتے ہوئے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ غالب کی طبیعت اتنی شگفتہ اور ہمہ جہت تھی کہ ان کی تحریریں فنی اور لسانی اعتبار سے بلند درجہ اختیار کرتے ہوئے ادب عالیہ کا حصہ بن گئیں۔ غالب کے بعد سر سید، محسن الملک، حالی، ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مولوی عبدالحق کے خطوط بھی ادبی دنیا میں اہمیت کے حامل ہیں۔

علامہ اقبال کے خطوط بھی ان کی شاعری کی طرح بہت اہم ہیں۔ اقبال کے خطوط میں اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کے ساتھ ساتھ ادبی مسائل کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ خطوط اقبال کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، جن میں شاہ اقبال، مکاتیب اقبال، خطوط اقبال اور انوار اقبال اہم مجموعے ہیں۔

خطوط غالب

(۱)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

مرزا صاحب!

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بزربان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورہ بھجوایا۔ ہاں، مرزا تقی نے ہاتر سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوجھ کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی جفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کار میگوں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے، یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں تاکہ خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کبھہ نہ رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غالب (۱۸۴۱ء تا ۱۸۵۸ء)

(۲) میر مہدی مجروح کے نام

بھائی! کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں۔ دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جنا کے پل کی، ہر سال میلہ بھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دہلی کہاں؟ ہاں! کوئی شہر، قلعہ و بند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر پندرہ دسمبر کو داخل ہوں گے۔ دیکھیے، کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جج، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دو جانہ، پاٹوڈی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں، تین جو باقی رہے، اس میں سے دو جانہ، لوہارو و تحت حکومت ہانسی۔ حصار، پاٹوڈی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادران دونوں کو یہاں لے آئے، تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس بس۔ رہے دربار عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خان، بکلی ماروں میں سب دنیا منوسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود، محروم و مغموں۔

- توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا

آسمان سے باد، گھنٹا گرجا کرے

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چچے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈبٹا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گول میدان نکلتا ہے۔ جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔ مجاہد العصر میر سرفراز حسین کو دُعا۔ حکیم الملک حکیم میر اشرف علی کو دُعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دُعا۔ یوسف ہند میر افضل علی کو دُعا۔

غالب

۲۲ دسمبر ۱۸۵۹ء

(مکاتیب غالب مرثیہ غلام رسول تہر)

Not For Sale

106

مشق

غالب نے مراسلہ کو مکالمہ کیسے بنایا؟ وضاحت کریں۔

غالب اپنے کلام کو کیوں ترستا ہے؟

غالب کے خطوط میں اکثر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پیدا شدہ صورت حال کا ذکر ملتا ہے۔

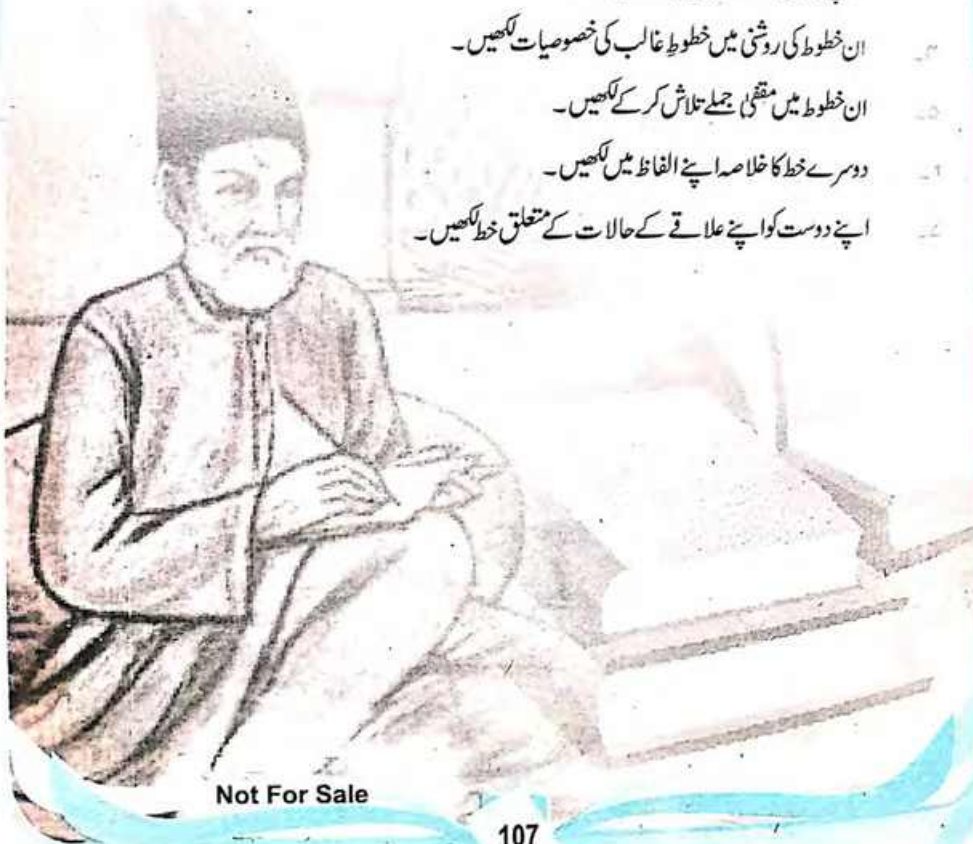
آپ اس بارے میں کیا جانتے ہیں؟

ان خطوط کی روشنی میں خطوط غالب کی خصوصیات لکھیں۔

ان خطوط میں مقفی جملے تلاش کر کے لکھیں۔

دوسرے خط کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

اپنے دوست کو اپنے علاقے کے حالات کے متعلق خط لکھیں۔



Not For Sale

107

مرکب اقبالؒ

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام

لاہور

۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء

مخدومی جناب مولانا انوارش نامہ ابھی ملا۔ اس سے پہلے بھی آپ کا خط مع تجویز ملا تھا، مگر میں علالت کے باعث جواب جلد نہ لکھ سکا۔ پہلے سے اچھا ہوں، مگر ابھی سفر کے لائق نہیں۔ خصوصاً جب کہ سفر بارہ گھنٹے سے زیادہ ہو۔ بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک سفر کے قابل ہو گیا تو ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا، لیکن اگر حاضر نہ ہو سکا تو یقین جانے کہ اس اہم معاملے میں کیسے آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصیت دینی عصیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ آپ کی تجویز میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ میرے خیال میں صرف دو باتیں زیر بحث آئیں گی۔ اول یہ کہ: فنڈ کہاں سے آئے گا؟ عام مسلمان کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ اُمرا توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان اُمرا مقروض ہیں۔ دوم یہ کہ صدر انجمن کا مستقر کہاں ہو؟ میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں۔

(۱) مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جولاڑیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی، اُن کا میدان پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی دقتیں پیش آئیں گی، کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی، مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔

Not For Sale

(۲) آپ انجمن اردو سے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی کامیابی بھی لاہور ہی میں ہو سکتی ہے، کیوں کہ یہ ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں۔

(۳) یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے۔ سادہ دل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر طرح کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت، اور مقامات سے بڑھ کر ہے۔ ایک معمولی جملے کے لیے آٹھ دس ہزار مسلمانوں کا جمع ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، بلکہ بیس بیس ہزار کا جمع بھی غیر معمولی نہیں۔ یہ بات پنجاب کے ہندوؤں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

باقی رہا آپ کے خط کا آخری فقرہ۔ سو میں اس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ انسان جب تک زندہ ہے، افکار و ترذات لازمہ حیات ہیں۔

معنوی اعتبار سے تودت ہوئی، میں نے اسے آپ پر ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب ظاہری اعتبار سے بھی چھوڑنا ہوں کیوں کہ آپ ایک صاحب عزم آدمی ہیں اور یہ بات مجھے مدت سے معلوم ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال



Not For Sale

والد گرامی (شیخ نور محمد) کے نام

لاہور ۳ جون ۱۹۲۰ء

قبلہ وکعبہ السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے بارے میں لکھا تھا۔ یہ طریق اچھا ہے اور اسی کو دستور العمل بنانا چاہیے۔ میں نے یورپ کے مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے جسم میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبت عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی چچی کی لمبی عمر ہوئی اور آخر عمر میں اس کا گزر ان زیادہ تر لسی پر تھا۔ ترش لسی تو شاید آپ کے لیے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ البتہ پیٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی جائے تو شاید مفید ہو۔ اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کوئی اچھا مکان رہنے کو نہیں ملتا۔ موجودہ مکان میں جوان لوگ توبہ آسائش رہ سکتے ہیں، بوڑھوں کو تکلیف ہے ورنہ بڑی خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ آپ کے پاس بسر کیا کرتے۔ ذرا ریل کا انتظام ٹھیک ہو جائے تو ان شاء اللہ آپ کی قدم بوی کے لیے حاضر ہوں گا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے آپ کے دانت بنائے تھے اگر وہ خراب ہو گئے ہوں تو ان کو ڈاک میں بھیج دیجیے گا، پھر مرمت کروائے جائیں گے۔ اگر وہ قابل مرمت بھی نہ ہوں تو لکھیے ڈاکٹر عبداللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ وہاں جا کر آپ کے دانت بنا دے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گھر سے سب آپ کی خدمت میں آداب لکھواتی ہیں۔

Not For Sale

110

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا امد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ دنیا کے حالات اور عام لوگوں کے حالات ایسے ہی ہیں ان کی طرف توجہ کرنا چاہیے عام لوگوں کی نگاہ بہت تنگ ہے۔ ان میں سے بیشتر حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا رومؒ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ چراغ لے کے تمام شہر میں پھرا کہ کوئی انسان نظر آئے گا مگر نظر نہ آیا اور موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے۔ اسی واسطے اخلاص، محبت و مروت و یک جہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ دور انتہائی تاریکی کا ہے۔ لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی ﷺ عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔ زیادہ کیا عرض کروں خدا کا فضل ہے۔

غلام رسول بیمار تھا۔ کل میں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فیروز پور تارویا تھا مگر تاحال جواب نہیں آیا۔ آج کل تاریکی دیر میں پہنچتے ہیں۔



Not For Sale

111

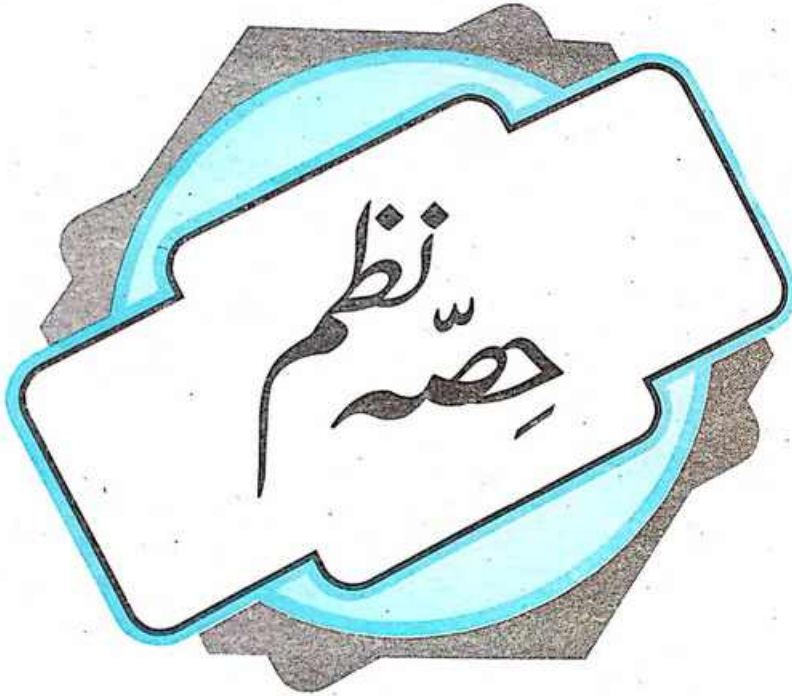
مشق

- ۱۔ اقبالؒ نے کھانے پینے کے معاملے میں حضور ﷺ کی کیا سنت بیان کی ہے؟
- ۲۔ اقبالؒ انجمن کے مستقر کے لیے لاہور کے انتخاب پر کیوں زور دیتے ہیں؟
- ۳۔ روحانیت کی کمی سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟
- ۴۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

- ۱۔ ”عام مسلمانوں کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ امر اتوجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان امر امروزش ہیں۔“
- ۲۔ ”یہ دور انتہائی تاریکی کا ہے۔ لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے۔“
- ۳۔ ”میری لسانی عصیت، دینی عصیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔“
- ۴۔ ”وہ کہتا ہے کہ انسان کے جسم میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور وہی کی لسی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ ذہر کے ہے۔“

مرتب

علامہ اقبالؒ نے دو نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے تلاش کر کے کوئی ایک خط لکھ کر اپنی میں نقل کریں۔



مشق

- ۱۔ ہر کے اشعار کے پس منظر میں اس مصرعے کی وضاحت کریں۔
- ۲۔ اس حمد میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے، انہیں اپنے الفاظ میں لکھیں۔
- ۳۔ حمد کی تعریف کریں۔ اس حمد کے علاوہ کوئی سے تین حمد یہ اشعار تحریر کریں۔
- ۴۔ قواعد کے حوالے سے جملے درست کریں۔

۱۔ ہر کے اشعار کے پس منظر میں اس مصرعے کی وضاحت کریں۔

۲۔ اس حمد میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے، انہیں اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۳۔ حمد کی تعریف کریں۔ اس حمد کے علاوہ کوئی سے تین حمد یہ اشعار تحریر کریں۔

۴۔ قواعد کے حوالے سے جملے درست کریں۔

۵۔ اس حمد کے قوانین لکھیں۔

۶۔ حمد کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

نظم:

- ۱۔ نظم کے نقشہ معنی ہیں "پرونا" جیسے موتی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ ادب کی زو سے اشعار کے مجموعے کو نظم کہتے ہیں۔
- ۲۔ "کسی ایک خیال یا موضوع کے تحت لکھے گئے اشعار کو نظم کہتے ہیں۔"

پابند نظم:

اس نظم میں وزن اور بحر کے ساتھ ساتھ قافیہ اور بسا اوقات ردیف کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔

Not For Sale

محسن کا گوروی

وفات: ۱۹۰۵ء

پیدائش: ۱۸۲۶ء

نام محمد محسن اور محسن ہی ان کا تخلص تھا۔ لکھنؤ کے ایک قصبے کا گوروی میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ کے حصول کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی اور عدالتی کاموں میں مشغول ہو گئے۔

بعد ازاں وکالت کا امتحان پاس کیا اور آگرے میں پریکٹس کرتے رہے۔ روایت ہے کہ محسن نو سال کے تھے کہ انہیں خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، جس پر اظہار مسرت کے طور پر انہوں نے ایک فارسی نظم لکھی۔ محسن کا گوروی کا زیادہ تر کلام حمدیہ اور نعتیہ ہے۔ ان کی وجہ شہرت بھی ان کا نعتیہ کلام ہے۔ ان کا کلام "نعت محسن" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

محسن کی شاعری مجموعی طور پر زبان دانی کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں عربی فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کی نعتوں میں صداقت اور خلوص موجود ہے۔ ان کا اسلوب شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ دبستان لکھنؤ سے تعلق کی وجہ سے ان کے ہاں شوکت الفاظ پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی ہے۔ بندشیں چست اور نادر و حسین تشبیہات اور استعارات نے ان کے کلام کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کا چناؤ اور مضمون کی بلندی ہمیشہ ہم آہنگ نظر آتی ہے اور یہ چیز ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ نعتوں کے علاوہ ان کے مجموعہ کلیات میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مناقب بھی موجود ہیں اور بعض دیگر اصناف پر بھی اشعار ملتے ہیں جن میں تاریخ گوئی بھی ملتی ہے۔

نعت

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے، سب سے افضل
میرے ایمان مفضل کا یہی ہے مجمل
گل خوش رنگ رسول ﷺ مدنی و عربی
زیب دامن ابد طرہ دستار ازل
اوج رفعت کا قمر، نخل دو عالم کا شر
بحر وحدت کا شہر، چشمہ کثرت کا کنول
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیرے خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل
ہو مرا ریشہ اُمید، وہ نخل سر سبز
جس کی ہر شاخ میں ہو پھول، ہر اک پھول میں پھل
ربخ انور کا ترے دھیان رہے بعد فنا
میرے ہمراہ چلے راہِ عدم میں مشعل
جنت محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی متانہ قصیدہ، یہ غزل

مشق

- ۱۔ حمد، نعت اور منقبت میں فرق واضح کریں۔
- ۲۔ شاعر نے رسول کریم ﷺ کے کیا کیا اوصاف بیان کیے ہیں؟ ان کی وضاحت کریں۔
- ۳۔ آخری تین اشعار میں کیا دعا کی گئی ہے۔
- ۴۔ اس نعت میں کون کون سی تشبیہات استعمال ہوئی ہیں؟
- ۵۔ اس نعت میں جن اصنافِ سخن کا ذکر ہوا ہے، ان کی تعریف کریں۔
- ۶۔ کلام میں ایک چیز کی مناسبت سے مختلف چیزوں کا ذکر ناجن میں کوئی تضاد نہ ہو مراعاة النظر کہلاتا ہے۔ مثلاً

جس کی ہر شاخ میں ہو پھول، ہر اک پھول میں پھل
اس شعر کے پہلے مصرعے میں نخل سر سبز کی مناسبت سے شاخ، پھول اور پھل کا ذکر کیا گیا ہے۔ کم سے کم تین اشعار
لکھیں جن میں صحت مراعاة النظر پائی جائے۔

طلبہ کمرہ جماعت میں نعت خوانی کی مشق کریں۔

- ۱۔ طلبہ کو تشبیہ کے مفہوم اور ارکان سے آگاہ کریں۔
- ۲۔ طلبہ کو اردو شاعری کی اصناف سے آگاہ کریں۔

نظیر اکبر آبادی



وفات: ۱۸۳۰ء

پیدائش: ۱۷۴۰ء

سید ولی محمد نظیر اکبر آبادی آگرے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ آگرے کے ایک مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ نظیر نے بڑے پُر آشوب زمانے میں ہوش سنبھالا۔ آگرے کے بُرے حالات نے انھیں ہجرت پر مجبور کیا اور وہ اپنی والدہ اور نانی کے ہمراہ دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی میں نظیر کا لڑکپن اور جوانی بڑی ہنسی خوشی اور رنگ رلیوں میں گزری۔ انھوں نے ہر قسم کی تقریبات اور تفریحات میں حصہ لیا۔ طبیعت موزوں تھی، اس لیے شاعری شروع کی۔

نظیر قناعت پسند، صوفی منش اور بے پروا طبیعت کے مالک تھے۔ ساری عمر معطلی کا پیشہ اختیار کیے رکھا۔ کسی نواب یا بادشاہ کے دربار سے وابستہ نہ ہوئے۔ آؤدھ اور بھارت پور کے حکمرانوں نے دعوت نامے بھیجے مگر نظیر نے قبول نہ کیے۔ اُن کی شاعری محض تخیل کی شاعری نہیں بلکہ اُنھوں نے جو کچھ دیکھا وہی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اُنھوں نے ایک طرف اپنی شاعری میں دہلی کے میلوں ٹھیلوں، تفریحات، کھیل تماشوں اور مذہبی تقاریب کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تو دوسری طرف اخلاقی مضامین اور تصوف پر بھی قلم اٹھایا۔

اُن کی شاعری میں عوامی مسائل اور عوامی خیالات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ایسی نظموں میں فکر آئے وال کا، روپے کی فلاحی، روٹی نامہ، آدمی نامہ اور مفلسی وغیرہ شامل ہیں۔

نظیر اکبر آبادی نظم میں ایک نئے طرز اور نئے انداز کے مؤجد تھے۔ وہ پُر گو شاعر تھے۔ اُن کی نظموں میں موسیقیت، روانی، جزیات نگاری اور منظر نگاری عروج پر ہے۔ مشکل اور ادا قافیے باندھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اُن کے کلام میں مذہبی رنگ موجود ہے۔ انبیائے کرام اور بزرگانِ دین سے عقیدت اُن کی شاعری میں موجود ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے طویل عمر پائی۔ آخری عمر میں وہ فالج میں مبتلا ہو گئے اور اسی مرض میں وفات پائی۔

مجموعہ کلام: بحیات نظیر اکبر آبادی

Not For Sale

نظیر اکبر آبادی

شہر آشوب

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند
رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موجد ار بند
ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے، یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھرا آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

صراف بچے، جوہری اور سیٹھ سا ہو کار
دیتے تھے سب کو نقد، سوکھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار
بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنے دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کی کوڑی نہ ہاتھ آئے
بے کار کب تلک کوئی قرض اور ادھار کھائے
دیکھوں جسے وہ کرتا ہے رورو کے ہائے
آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند

Not For Sale

اس شہر کے فقیر بھکاری جو ہیں تباہ
جس گھر میں جا سوال وہ کرتے ہیں خواہ مخواہ
بھوکے ہیں کچھ بھجائیو بابا خدا کی راہ
واں سے صدایہ آتی ہے: ”پھر مانگو“ جب دُعا
کرتے ہیں ہونٹ اپنے وہ ہو شرم سار بند

کیا چھوٹے کام والے دیکھا پیشہ ورنجیب
روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آشام عتقرب
اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

ہے کون سا وہ دل بے فرسودگی نہیں
وہ گھر نہیں کہ روزی کی نالودگی نہیں
ہر گز کسی کے حال میں بہبودگی نہیں
اب آگرے کے نام کو آسودگی نہیں
کوڑی کے آکے ایسے ہوئے رہ گزار بند

ہے میری حق سے اب یہ دُعا شام اور سحر
سب کھاویں پیویں یاد رکھیں اپنے اپنے گھر
کھل جاویں ایک بار تو سب کاروبار بند
اس ٹوٹے شہر پر بھی الہی تو فضل کر
ہو آگرے کی خلق پہ پھر مہر کی نظر

(نہایت نظیر اکبر آبادی)

- ۱۔ اس نظم کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں لکھیں۔
- ۲۔ اس نظم میں کن کن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے؟ ان کی وضاحت کریں۔
- ۳۔ شہر آشوب کی تعریف کریں۔ کسی اور شاعر کے شہر آشوب کے چند اشعار لکھیں۔
- ۴۔ ”پھر مانگو“ سے کیا مراد ہے؟
- ۵۔ شاعر نے گھر کی مفلسی کا کیا نقشہ کھینچا ہے؟
- ۶۔ ”جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند“ اس مصرعے میں تشبیہ پائی جاتی ہے۔ تشبیہ کی تعریف کریں اور اشعار میں مثالیں دیں۔
- ۷۔ یہ نظم کس ہیئت میں ہے؟ وضاحت کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

ہیئت کی وضاحت کریں اور مختلف ہیئتوں میں لکھی گئی نظموں کی مثالیں دیں۔

نام میر غلام حسن اور حسن تخلص ہے۔ وہ نامور بھگو میر ضاحک کے بیٹے، میر خلیق کے والد اور مشہور مرثیہ نگار میر انیس کے دادا تھے۔ دلی کے سیدواڑ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ دلی کا شہر جو کئی بار اجڑا، ان کے زمانے میں بھی ویران ہو گیا، تو وہ اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے جو اس زمانے میں اودھ کا دار الحکومت تھا۔ یہاں وہ نواب سالار جنگ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دار الحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے۔

شعر و شاعری کا ملکہ اُن کو ورثے میں ملا۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ اُن کی شہرت غزلیات یا قصائد سے نہیں، بلکہ صرف مثنوی "سحر البیان" کی وجہ سے ہے۔ ایک روایتی داستان جو دراصل شہزادہ نے نظیر اور شہزادی بدر میں کافسانہ عشق ہے لیکن میر حسن نے اپنے انداز بیان سے اسے واقعیت اور حقیقت کا رنگ دے دیا۔ واقعہ نگاری، کردار نگاری اور منظر کشی کے ساتھ انھوں نے اپنے زمانے کے رسم و رواج اور تمدن کی تصویر کشی بھی کی ہے۔

میر حسن کے کلام میں ان کی یادگار غزلیات و قصائد کا ایک دیوان، مثنویات کا ایک مجموعہ اور شاعروں کا ایک تذکرہ شامل ہے۔

شہزادے کا چھت پر سونا اور پری کے ہاتھوں اغوا ہونا

قضا را وہ شب تھی شب چار وہ
نظارے سے تھا اُس کے دل کو سرور
عجب لطف تھا سیر مہتاب کا
ہوا شاہ زادے کا دل بے قرار
کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ
کہا نقشہ نے اب تو گئے دن نکل
قضا را وہ دن تھا اُسی سال کا
بچن مولوی کا یہ سچ ہے قدیم
وہ سونے کا جو تھا بچاؤ پلنگ
کچنی چادر ایک اس پہ شبنم کی صاف
دھرے اُس پہ بچکے کئی نرم نرم
کبھی نیند میں جب کہ ہوتا تھا وہ
چھپائے سے ہوتا نہ، حُسن اُس کا ماند
وہ سویا جو اُس آن سے بے نظیر
ہوا اُس کے سونے پہ عاشق جو ماہ
وہ مہ اُس کے کوٹھے کا ہالہ ہوا
وہ پھولوں کی خوشبو، وہ سُٹھرا پلنگ
جہاں تک کہ چوکی کے تھے باری دار

پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
عجب عالم نور کا تھا ظہور
کہے تو کہ دریا تھا مہتاب کا
یہ دیکھی جو واں چاندنی کی بہار
کہا: آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ
اگر یوں ہے مرضی، تو کیا ہے خلل
غلط وہم ماضی میں تھا حال کا
کہ آگے قضا کے، ہو احق حکیم
کہ سیمیں تنوں کو ہو جس پر اُمنگ
کہ ہو چاندنی، جس صفا کی غلاف
کہ مٹل کو ہو جس کے دیکھے سے شرم
تو رخسار رکھ اُس پہ سوتا تھا وہ
دیے تھے لگا اُس کے مکھڑے کو چاند
رہا پاساں اُس کا بدر منیر
لگا دی ادھر اُس نے اپنی نگاہ
غرض واں کا عالم دوبالا ہوا
جوانی کی نیند اور وہ سونے کا ڈھنگ
ہوا جو چلی، سو گئے ایک بار



میر بر علی انیس

وفات: ۱۸۷۴ء

پیدائش: ۱۸۰۰ء

میر بر علی انیس میر خلیق کے فرزند اور میر حسن کے پوتے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق انہیں گھر پر ہی تعلیم دی جاتی رہی۔ گھر کے باہر ان کے پہلے استاد میر نجف علی فیض آبادی تھے۔ زمانہ طالب علمی میں انیس کو مقولات اور لسانی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں لگ بھگ دو ہزار کے قریب نسخے تھے۔ زمانے کے رواج کے مطابق انہوں نے شہ سواری اور شیر زنی بھی سیکھی۔ بعد میں فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ ہمیشہ چاق و چوبند رہا کرتے تھے۔ طبعاً خوش مزاج اور حاضر جواب تھے۔

انیس نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن ان کی شہرت کا مدار مرثیہ نگاری پر ہے۔ ان کے زمانے میں مرثیہ خوانی کے لیے تحت اللفظ اور سوز کا انداز اپنایا جاتا تھا۔ انیس نے دونوں طرح پر پڑھنے کے لیے مرثیے لکھے اور کامیاب رہے۔ ان کا اسلوب سادہ، رواں اور آسان ہے۔ انسانی جذبات کا بیان انہوں نے جس طرح کیا ہے، شاید ہی کوئی کر سکے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے مرثیوں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے۔

میر انیس کے مرثیے پانچ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے مرثیوں کے علاوہ سلام اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ ان رباعیات میں بھی ان کا رنگ صوفیانہ ہے۔ مگر ان کا کمال مرثیے کے فن میں زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

مجموعہ کلام: نکلیات میر انیس

فقط جاگتا ایک مہتاب تھا
پڑی شاہ زادے پر اُس کی نظر
وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اتار
مُور ہے سارا زمیں آسمان
کہ جیسے ہودو چشموں کی ایک سوت
کہ لے چلے اس کا امانت پلنگ
وہاں سے اُسے لے اُڑی دل رُبا
اُڑا کر وہ اُس کو پرستان میں
زمانے کی جب سے ہے پست و بلند

(مشق "سحر البیان")

غرض سب کو واں عالم خواب تھا
تقدیر بنا ایک پری کا مُور
ہوئی حسن پر اس کے جی سے بشار
جو دیکھا، تو عالم عجب ہے یہاں
ہوئی دونوں کے حسن کی ایک جوت
سے عشق میں بھر یہ سُبھی ترنگ
نُجست کی آئی جو دل میں ہوا
غرض لے گئی آن کی آن میں
بکھی دل رہے خوش بکھی درد مند

مشق

۱۔ پاندنی رات کا منظر اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۲۔ مصرعے کی وضاحت کریں۔

۳۔ مشق کی تعریف کریں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

۵۔ اس نظم سے وہ اشعار لکھیں جن میں تشبیہ استعمال ہوئی ہو۔

۶۔ اس شعر میں خوش، درد مند اور پست و بلند متضاد الفاظ ہیں، اس طرح کے متضاد الفاظ سے کلام میں اثر اور معنی آفرین پیدا ہوتی ہے۔ اسے صنعت تشاد کہتے ہیں۔ آپ ایسے تین اشعار لکھیں جن میں صنعت تشاد پائی جاتی ہو۔

اس شعر میں خوش، درد مند اور پست و بلند متضاد الفاظ ہیں، اس طرح کے متضاد الفاظ سے کلام میں اثر اور معنی آفرین پیدا ہوتی ہے۔ اسے صنعت تشاد کہتے ہیں۔ آپ ایسے تین اشعار لکھیں جن میں صنعت تشاد پائی جاتی ہو۔

جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا
دشتِ بلا نمونہ خلد بریں ہوا
سر جھک گیا فلک کا، یہ اوجِ زمیں ہوا
خورشیدِ محسنِ حسینِ حسین ہوا

پایا فروغِ نیرِ دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

خوشبو سے اُن گلوں کی ہوا دشتِ باغِ باغ
غنیچے کھلے، ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
پہنچا سرِ فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ
دریا نے بھی جابوں کے روشن کیے چراغ

خورشید بن گئے طبقے ارضِ پاک کے
تاروں کو گرد کر دیا ذروں نے خاک کے

بولے فرس کو روک کے شاہِ فلک وقار
منزل پہ ہم پہنچ گئے، احسانِ کردگار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار
یہ وہ زمیں تھی، جس کے لیے دل تھا بے قرار

قربان اس مکانِ سعادت نشان کے
پایا دُر مراد بڑی خاک چھان کے

اُتر دے مسافرو! کہ سفر ہو چکا تمام
سوچ اب نہ ہوگا حشرِ تلک، ہے یہیں مقام
مقتل یہی زمیں ہے، یہی مشہدِ امام
اُونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیم

بسترِ لگاؤ شوق سے، اس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا یاں کی خاک پر

توشہ مسافروں کا یہی، اور یہی ہے زاد
یہ خاک آبِ خضر سے رتبے میں ہے زیاد
طوفاں میں اس کو ڈالے گا جو مردِ خوش نہاد
لے آئے گی ہوائے موافق دُر مراد

دیکھے گا یاس میں کرمِ کارساز کو
تھامے گا دستِ موج سے دریا جہاز کو

اُترا یہ کہہ کے کشتی اُمت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا:
دیکھو تو! کیا ترائی ہے، کیا نہر، کیا فضا

اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر



مرزا سلامت علی دیر

وفات: ۹ مارچ ۱۸۷۵ء

پیدائش: ۱۸۰۳ء

مرزا سلامت علی دیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ سات برس کے تھے جب ان کے والدین دہلی سے لکھنؤ چلے آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ مرزا دیر نے مروجہ علوم کی تحصیل کا سلسلہ یہاں سے شروع کیا۔ عربی اور فارسی یہاں کے بچہ علما سے پڑھی۔

فن شاعری میں مرزا دیر، میر ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ مرزا دیر نہایت سلیم الطبع اور عالی ظرف انسان تھے۔ اپنے ہم عصر مرثیہ گوانیس سے شاعرانہ چشمک کے باوجود کبھی نازیبا جملہ منہ سے نہیں نکالا۔

مرزا دیر کے مرثیے اپنی گھٹن گرج، آب و تاب اور زبان و بیان کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔ انداز بیان کا رعب و دبدبہ، لکھنوی اثرات، منظر نگاری، لفظی صنعت گری، واقعہ نگاری، بے ساختہ پن، حسن تشبیہ اور سراپا نگاری وغیرہ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

مرزا دیر میرانیس کے ہم عصر تھے۔ مگر یہ بات مسلمہ ہے کہ مرزا دیر مرثیہ گوئی کے میدان میں انیس سے پہلے داخل ہوئے۔ میرانیس کے کلام کا شہرہ ہو جانے کے باوجود ان کے کمالات کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہا۔

مجموعہ کلام: مرثیاتی دیر

بولے یہ اٹک۔ بحر کے شہنشاہ سر بلند
کیوں، یہ مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند؟
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہ ارجمند!
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شیراب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
میں کیا کہوں حضور! تراکی غضب کی ہے

مشق

- ۱۔ مرثیہ کے کچے ہیں؟
- ۲۔ شاہدین کٹی امت کا خدا، شہنشاہ سر بلند ان تمام تراکیب سے کون سی ہستی مراد ہے؟

۳۔ اس مصرعے کی وضاحت کریں۔

۴۔ اپنے جہوں میں اس طرح استعمال کریں کہ مضموم واضح ہو جائے۔

۵۔ دوسرا مصرع بیان کریں۔

(ب) مرثیہ شوق سے اس ارض پاک پر

- ۱۔ کلام میں کسی بات کی کوئی ایسی وجہ بیان کرنا جو درحقیقت اس کی وجہ نہ ہو، لیکن کلام میں خوبصورتی پیدا کرتی ہو۔ مثلاً: کبلائی ہے۔ مثلاً: "دور" کے پہلے بند میں فلک کے سر جھکانے کی وجہ شاہ دیں کے کربا میں داخل ہونے کو قرار دیا گیا ہے جو فلک کے جھکنے کی اصل وجہ نہیں ہے۔ آپ حسن تعلیل کی دو مثالیں پیش کریں۔

تختِ فرس پہ علی اکبرؑ کا خطاب

شہزادے نے جلوہ جو کیا دامنِ زیں پر
پھر زین نے آوازہ کسا مہرِ ہمیں پر
مرگب نے قدمِ فخر سے رکھا نہ زمیں پر
سرعت سے کہا فرشِ بچھا عرشِ بریں پر

پکوں سے لیا پنچے میں شہبازِ قضا کو
بغلوں کے شکنجے میں کیا قیدِ ہوا کو

اک عالمِ حیرت تھا، چہ لاہوت، چہ ناسوت
سب جرم سے تاب تھے چہ باروت، چہ ماروت
سب خوف سے تھے زرد چہ خورشید، چہ یاقوت
سکتے تھے سلاطین کو، نے تخت، نہ تابوت

بے خود جو کیا رُوئے درخشاں کی چمک نے
بالائے زمیں ٹیک دیے ہاتھِ فلک نے

رہوار کے کاووں سے زمیں چرخ میں آئی
پر عرقِ عرق ہو گیا وہ حق کا فدائی
چہرے پہ عجب آبِ پینے نے دکھائی
ان قطروں سے نیساں پہ گنا شرم کی چھائی

یہ قدرِ عرق کی نہ کسی رو سے بڑھی تھی
شبنمِ کبھی خورشید کے منہ پر نہ پڑی تھی

ہاتھ کا عرق پاک کیا انگلی سے بارے
سورج سے کیے دُور مہِ نو نے ستارے
حیدر کے لب و لہجے میں لشکر کو پکارے
ہاں غافلوا! آگاہ ہو رُتبے سے ہمارے

اللہ کے بندے ہیں پہ اللہ نہیں ہیں
بندے مگر اس طرح کے واللہ نہیں ہیں

تن پر رہ معبود میں ہم سر نہیں رکھتے
ہم سر کے کٹا دینے میں ہمسر نہیں رکھتے
جز دستِ گدا اور کہیں زر نہیں رکھتے
تکیہ کرمِ حق پہ ہے، بستر نہیں رکھتے

یہ اُن پہ کھلا ہے کہ جو خاصانِ خدا ہیں
ہر بندے کے ہم بند گشا عقد گشا ہیں

احکامِ یزید اور ہیں اور اپنے امور اور
باطل کی نمود اور ہے اور حق کا ظہور اور
نمرود کی آگ اور ہے اور آتشِ طور اور
زبور کا غل اور ہے الحانِ زبور اور

سمجھو تو سہی تم کہ بشر کیا، ہیں ملک کیا
بُت کیا ہے، خدا کیا ہے، زمیں کیا ہے، فلک کیا



الطاف حسین حالی

وفات: ۱۹۱۴ء

پیدائش: ۱۸۳۷ء

الطاف حسین حالی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے، تاہم ذاتی کوشش سے عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کی۔ حصول تعلیم کے شوق میں دلی گئے، جہاں غالب اور شیفتہ سے ملاقاتیں ہوئی۔ چند سال شیفتہ کے مصاحب رہے۔ ۱۸۷۳ء میں لاہور میں ملازمت مل گئی اور انگریزی سے ترجمہ ہوئے۔ والی کتابوں پر نظر ثانی کرتے رہے۔ یہاں جدید نظم کے چار مشاعروں میں شریک ہوئے۔ پنگلو عربک سکول دلی میں مدرس ہو گئے۔ وہاں سرسید اور ان کی تحریک سے رابطہ ہوا۔ سرسید کے ایما پر مسند ”مد و جزر اسلام“ لکھی۔ اس کے بعد بہت سی نظمیں لکھیں اور کئی جدید نظم نگار شعراء کو متاثر کیا۔ مولانا حالی اور آزاد دونوں کی مشترکہ کوششوں سے اردو شاعری بہت حد تک تبدیل ہو گئی اور اس میں پہلی بار مشرقی خیالات کے ساتھ مغربی خیالات بھی سامنے آئے۔ حالی نے غزل کو بھی جدید رنگ میں ڈھالا اور روایت کی بے جا تقلید کے بجائے تازگی بیان پر توجہ دی۔ حالی کی غزل میں میر و غالب کا ساتھ ملتا ہے جب کہ ان کی نظمیں جذبہ حب الوطنی اور اصلاح ملت کا ثبوت ہیں۔ اردو شاعری میں پہلی مرتبہ حالی نے قومی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ حب الوطن، چپ کی داد، نشاطِ اُمید اور مناظرہ رحم انصاف جیسی نظمیں اس کی درخشندہ مثالیں ہیں۔ حالی نے پانی پت میں وفات پائی۔

تصانیف: مقدمہ شعر و شاعری، حیات جاوید، حیاتِ سعدی وغیرہ۔

Not For Sale

سماں سے کوئی صاحب ایمان نہیں ہوتا
ہر اہل عصا موبقِ عمران نہیں ہوتا
پہنے جو انبوخی وہ سلیمان نہیں ہوتا
آئینہ گر اسدِ دریاں نہیں ہوتا

لاکھ آج ہو پٹھے کا، ہما ہو نہیں جاتا
بتِ بجد کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

(سرائی دیر)

مشق

- ۱۔ حضرت علیؑ اپنے خطاب میں کیا ارشاد فرمایا؟
- ۲۔ ان شعر میں جن کی تفسیر تاجذکر ہوا ہے، ان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
- ۳۔ قصیدے سے مراد کونسی چیز ہے؟ جن میں صنعت و تضاد کا استعمال ہو۔
- ۴۔ مرثیہ کی تعریف کریں اور مرثیے کے ارکان کی وضاحت کریں۔
- ۵۔ کسی اور مرثیے کے تین اشعار لکھیں، جن کا موضوع واقعات کر بلا ہو۔

حیاتِ بے آواز
ظہورِ امتداد کے بارے میں مستند معلومات فراہم کریں۔

Not For Sale

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجا تو
جھٹک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فردہ دلوں کے دل آکر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

سفینہ بے نوح طوفان میں تو تھی
سکون بخش یعقوب کنعاں میں تو تھی
زلیخا کی غمخوار بہراں میں تو تھی
دل آرام یوسف کی زنداں میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے
مگرتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اکھڑتے دلوں کو بجایا ہے تو نے
اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی
بندگی تجھ سے ڈھارس ہے خرد و کلاں کی
خجھی پر ہے بنیاد مظہم جہاں کی
نہ ہو تو تو رونق نہ ہو اس دکان کی

تگاپو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
روارد ہے ہر قافلے میں تجھی سے

نوازا بہت بے نواؤں کو تو نے
توگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دسترس نارساؤں کو تو نے
کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے

سکندر کو شان کئی تو نے بخشی
گلمیس کو دنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہرو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں
خور و زاد سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں
نہ محرم کوئی جو سنے دردِ پنہاں

ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانے ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اٹھتا ہے جوتا
سمیں کا گماں تک نہیں جب کہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا
مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا



اکبر الہ آبادی

وفات: ۱۹۲۱ء

پیدائش: ۱۸۳۵ء

اصل نام سید اکبر حسین اور اکبر ہی تخلص تھا۔ الہ آباد میں ولادت ہوئی۔ رسمی تعلیم بہت کم تھی۔ ذاتی کوشش سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۰ء میں ”جوڈیشل سروس“ کے لیے منتخب ہوئے۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ اُن کا شمار اردو کے نام ور شعرا میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری امتیازی اور انفرادی خصوصیات کی حامل ہے اور ان کی مقبولیت کا دار و مدار ان کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری پر ہے۔

اکبر نے اپنی شاعری کا آغاز سنجیدہ کلام سے کیا تھا لیکن جلد ہی انھوں نے ایک پیامی شاعر کا منصب اختیار کیا۔ انگریز جو تہذیب اپنے ساتھ لائے تھے، وہ اکبر کو سخت ناپسند تھی۔ چنانچہ قدیم تہذیب کی حمایت اور جدید تہذیب کی مخالفت ان کی زندگی کا نصب العین رہا۔ اکبر بہت بے خوف آدمی تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انگریزی تہذیب و تمدن پر سخت تنقید کرتے رہے۔ اس سلسلے میں آنے والی مشکلات کا اندازہ لگاتے ہوئے انھوں نے طنز اور ظرافت کا انداز اختیار کیا۔ اُن کے انداز اور اسلوب نے ایسی عالمگیر شہرت اختیار کی کہ آج بھی لوگ انھیں ”لسان العصر“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں وفات پائی۔

مجموعہ کلام: کلیات اکبر

اگر موجزن اُس کے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بے اس سے بھی گر ہوا اپنے دم پر
بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر
پہاڑ اک فزوں اور ہو کوہ غم پر
گزرنی ہو جو کچھ گزر جائے ہم پر

نہیں فکر، تو دل بڑھاتی ہے جب تک
دماغوں میں بے تیری آتی ہے جب تک

(مسدس مدو جزا اسلام)

مشق

- ۱۔ جس نظم کے ہر بند میں جتنے مصرعے ہوں اسے مسدس کہتے ہیں۔ آپ کی کتاب میں کون کون سی ایسی نظمیں شامل ہیں جو مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں؟
- ۲۔ دوسرے بند کی وضاحت تاریخی حقائق کی روشنی میں کریں۔
- ۳۔ نظم ”امید“ کا خلاصہ لکھیں۔
- ۴۔ نظم میں جو الفاظ ایک دوسرے کے متضاد استعمال ہوئے ہیں، ان کی نشاندہی کریں۔
- ۵۔ تصحیح کی تعریف کریں اور اس نظم سے تمیحات چن کر ان کی وضاحت کریں۔
- ۶۔ مجاز و سبک کی تعریف کریں اور مثالیں دیں۔

Not For Sale

Not For Sale

نصیحت اخلاقی

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں، آنکھوں کا نور ہے
 گھر میں اسی کے دم سے ہے ہرست روشنی
 خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں
 اکبر بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق
 البتہ شرط یہ ہے، کہ بیٹا ہے ہونہار
 سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کی پسند کو
 برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
 افکار والدین میں ہے دل سے وہ شریک
 راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
 رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال
 کسب کمال کی ہے شب و روز اس کو دھن
 لیکن جو ان صفات کا مطلق نہیں پتا
 ہے زندگی کا لطف، تو دل کا سرور ہے
 نازاں ہے اس پہ باپ، تو ماں کو غرور ہے
 کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے
 اس کا بھی ہے یہ قول، کہ ایسا ضرور ہے
 مائل ہے نیکیوں پہ، برائی سے دور ہے
 وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے
 اس میں نہ ہے فریب نہ ہے مکر و زور ہے
 ہمدرد ہے معین ہے اہل شعور ہے
 صابر ہے باادب ہے عقیل و غیور ہے
 نیکیوں کا دوست صحبت بد سے نفور ہے
 علم و ہنر کے شوق کا دل میں دفور ہے
 اور پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

(کلیات اکبر حصہ اول)

مشق

- ۱۔ اس نظم میں اکبر الہ آبادی نے ہونہار بیٹے کی کیا خصوصیات بتائی ہیں؟
- ۲۔ نظم ”نصیحت اخلاقی“ کا خلاصہ لکھیں۔
- ۳۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کے معنی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔
 نازاں، ظہور، مکر و زور، کسب کمال، اہل شعور۔
- ۴۔ اس نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں۔
- ۵۔ اس نظم کے قوانین لکھیں۔

ہدایت برائے اساتذہ:

طلبہ کو طنز و مزاح کی تعریف بتائیں نیز دونوں کے فرق اور اہمیت سے روشناس کریں۔

حَفِیظ جالندھری



وفات: ۱۹۸۲ء

پیدائش: ۱۹۰۰ء

محمد حفیظ نام اور حفیظ ہی تخلص تھا۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ شمس الدین تھا۔ اُن کے اُستاد انھیں ابوالاثر حفیظ کہتے تھے اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم جالندھر ہی میں ہوئی۔ وہ خاندانی حالات اور خانگی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ وہ بائیس سال کی عمر میں جالندھر سے لاہور آئے۔ یہاں کی ادبی فضا میں ان کے ادبی جوہر خوب کھلے اور جلد ہی وہ اپنے دور کے ممتاز شعرا میں شمار ہونے لگے۔

انھوں نے پاکستان کا قومی ترانہ اور اسلام کی منظوم تاریخ ”شاہنامہ اسلام“ کے عنوان سے رقم کی۔ ان دونوں تخلیقات نے انھیں زندہ جاوید بنادیا۔

حفیظ بنیادی طور پر گیت نگار ہیں۔ اُن کے گیت جذبات اور لطافت سے بھرپور ہیں۔ وہ عام طور پر چھوٹی اور مترنم بحر میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی خصوصیت غنایت اور شکستگی ہے۔ اُن کی شاعری میں ہندی الفاظ کا بے تکلفانہ انداز، ان کے کلام میں مٹھاس پیدا کر دیتا ہے۔ انھوں نے نظموں میں قابلِ قدر تجربے بھی کیے۔ سادگی، دلکشی، موسیقیت، تغزل، منظر کشی، ندرتِ تشبیہات، مقصدیت اور متنوع بحروں کا استعمال ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تصانیف: سوز و ساز، تخیل بہ شیریں، تسویرِ کشمیر، بہار کے پھول، نغمہ زار، حفیظ کے گیت، حفیظ کی نظمیں اور چوٹی نامہ۔

Not For Sale

142

حفیظ جالندھری

جلوۂ سحر

چلا	ستارۂ	سحر	سنا کے صبح کی خبر
زمیں	پہ نور چھا گیا	فلک	پہ رنگ آگیا
تمام	زادگانِ شب	چمک	چمک کے سو گئے
شرار	آسمانِ شب	دک	دک کے سو گئے
ستارے	زرد ہو چکے	چراغ	سرد ہو چکے
وہ ٹٹمٹما	کے رہ گئے	یہ جھلجھلا	کے رہ گئے
چلا	ستارۂ	سحر	سنا کے صبح کی خبر

یکا یک	ایک نور کا	غبار	شرق سے اٹھا
وہ رفتہ رفتہ	بڑھ چلا	اور آسمان	پہ چھا گیا
حسینہ	نمود نے	نقاب	اٹھا دیا
فُسنوں	گر شہود نے	طلسم	شب مٹا دیا
یکا یک	ایک تازگی	یکا یک	ایک روشنی
نگاہ	جاں میں آگئی	حیات	میں سما گئی
یکا یک	ایک نور کا	غبار	شرق سے اٹھا

Not For Sale

143

عبادتوں کے در کھلے عبادتوں کے در کھلے
در قبول وا ہوا دُعا کا وقت آگیا
اذان کی صدا اُٹھی جگا دیا نماز کو
چلی ہے اٹھ کے بندگی لیے ہوئے نیاز کو
صنم کدہ بھی کھل گیا اٹھا ہے شور سکھ کا
چلو نمازیو! چلو اٹھو پجاریو! اٹھو
عبادتوں کے در کھلے عبادتوں کے در کھلے

کسان اٹھ کھڑے ہوئے مویشیوں کو لے چلے
کہیں مزے میں آگئے تو کوئی تان اڑا گئے
یہ سرد شبنمی ہوا یہ صحت آفریں سماں
یہ فرش بزر گھاس کا یہ دل فریب آسماں
بے ہوئے پریت میں ہیں محو ان کے گیت میں
کہاں ہیں شہر کے کیں وہ بے نصیب اٹھے نہیں
کسان اٹھ کھڑے ہوئے مویشیوں کو لے چلے

اُٹھی حسینہ سحر پہن کے سر پہ تاج زر
لباس نور زیب بر چڑھی فراز کوہ پر
وہ خندہ نگاہ سے پہاڑ طور بن گئے
وہ عکس جلوہ گاہ سے سحاب نور بن گئے
نوائے جوہار اُٹھی صدائے آبشار اُٹھی
ہواؤں کے رباب اُٹھے خوش آمدید کے لیے
اُٹھی حسینہ سحر پہن کے سر پہ تاج زر

(سرماۃ اردو، انتخاب از حافظ محمود شیرانی)

مشق

- ۱۔ ”جلوہ سحر“ میں پیش کیا گیا صبح کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
- ۲۔ اس نظم میں صبح کا منظر بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ شام کے منظر کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
- ۳۔ آخری بند میں شاعر نے صبح کو ”حسینہ سحر“ کے ایک کردار کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اس کے استقبال کو کن لفظوں میں بیان کیا ہے؟
- ۴۔ جملے بتائیں۔

۱۔ یکا یک۔ سعادت۔ صحت آفریں۔ جلوہ گاہ۔ جوہار۔ آبشار۔

- ۵۔ کنایہ کی تعریف کریں اور مثالوں کی مدد سے وضاحت کریں۔

سید محمد جعفری



پیدائش: ۱۹۰۵ء

وفات: ۱۹۷۶ء

سید محمد جعفری نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی آنرز (کیمیا) کی سند حاصل کرنے کے بعد علم کی تشنگی بچانے کے لیے ایم اے فارسی اور ایم اے انگریزی ادبیات کیا۔ ان کے اساتذہ میں ممتاز مزاج نگار پطرس بخاری بھی شامل تھے۔ سید محمد جعفری نے مصوری اور خطاطی کی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی۔ کچھ عرصہ محکمہ تعلیم سے منسلک رہے۔ بعد ازاں وزارت اطلاعات و نشریات سے وابستہ ہو گئے اور وہیں سے ریٹائرمنٹ لی۔ سید محمد جعفری کا شمار ایسے طنزیہ اور مزاحیہ شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے ظرافت اور طنز کو ملکی اور سماجی اصلاح کا ہر ہتھیار بنایا۔ ان کا طنز کاری ضرور ہے مگر اس قدر شگفتہ ہے کہ قاری کو نہ صرف لطف اندوز کرتا ہے بلکہ غور و فکر اور اصلاح کی دعوت بھی دیتا ہے۔ وہ ملکی ثقافت اور تہذیب و تمدن کو مغربی اثرات سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم ”پرانا کوٹ“ میں انھوں نے غلامانہ ذہنیت کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ماضی سے عبرت حاصل کرنے کا درس دیا ہے۔

مجموعہ کلام: شوقی تحریر

Not For Sale

سید محمد جعفری

پرانا کوٹ

خریدا جاڑوں میں نیلام سے پرانا کوٹ
جو پھٹ کے چل نہ سکے، یہ نہیں ہے ایسا نوٹ

بنا ہے کوٹ یہ نیلام کی دکان کے لیے
”صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے“

بڑا بزرگ ہے یہ آزمودہ کار ہے یہ
کسی مرے ہوئے گورے کی یاد گار ہے یہ

پرانی وضع کا بے حد عجیب جامہ ہے
پہن چکا اسے خود ”واسکوڈی گاما“ ہے

نہ دیکھ کہنیوں پر اس کی خستہ سامانی
پہن چکے ہیں اسے ٹرک اور ایرانی

جگہ جگہ وہ پھرا مثل ”مارکو پولو“
وہ کوٹ کوٹوں کا لیڈر ہے اس کی بے بولو

بڑا بزرگ ہے گو وہ قلیل قیمت ہے
میاں! بزرگوں کا سایہ بڑا غنیمت ہے

ہیں اس پہ دھبے جو سرخی کے اور سیاہی کے
نشان ہیں کسی ٹیچر کی بادشاہی کے

Not For Sale

- ۱- شاعر نے پرانے کوٹ کی خامیوں کو کیسے خوبیاں بنا کر پیش کیا ہے۔
- ۲- تشبیہ اور استعارے سے کیا مراد ہے؟ اس نظم میں شاعر نے پرانے کوٹ کے لیے کیا تشبیہات اور استعارات استعمال کیے ہیں؟
- ۳- مصرعے مکمل کریں۔
 - (ا) کسی مرے ہوئے گورے کی _____
 - (ب) پہن چکے ہیں اسے _____
 - (ج) میاں بزرگوں کا سایہ _____
 - (د) نئی طرح کی یہ صنعت ہے _____
 - (ه) گذشتہ صدیوں کی تاریخ کا _____
- ۴- نظم ”پرانے کوٹ“ کا مرکزی خیال لکھیں۔
- ۵- قافیہ ہم آواز الفاظ کو کہتے ہیں، جیسے کوٹ اور نوٹ، دکان اور نکتہ داں، اس نظم میں اور کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟
- ۶- کسی شاعر کے ایک مصرعے پر دوسرا مصرع لگا کر نیا شعر کہنا ”صنعتِ تضمین“ کہلاتا ہے۔ مثلاً:

بنا ہے کوٹ یہ نیلامی کی دکان کے لیے ”صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے
ایسے تین اشعار تحریر کریں جن میں صنعتِ تضمین کا استعمال ہو۔

جگہ جگہ جو یہ کیزوں کی ضرب کاری ہے
نئی طرح کی یہ صنعت ہے، دستکاری ہے
جو قدر دان ہیں، وہ جانتے ہیں قیمت کو
کہ آفتاب چرا لے گیا ہے رنگت کو
یہ کوٹ کوٹوں کی دنیا کا باوا آدم ہے
اگرچہ بے ود نگہ، جو نگاہ سے کم ہے
دہان زخم کی مانند ہنس رہے ہیں کاج
وصول کرتے ہیں چینی کی انکھریوں سے خراج
جگہ جگہ جو یہ دجے ہیں اور چکنائی
پہن چکا ہے بھی اس کو کوئی حلوائی
گذشتہ صدیوں کی تاریخ کا ورق ہے کوٹ
خریدو اس کو کہ عبرت کا اک سبق ہے کوٹ

(شوخی، تحریر)

سید ضمیر جعفری



وفات: ۱۲ مئی ۱۹۹۹ء

پیدائش: یکم جنوری ۱۹۱۶ء

اصل نام سید ضمیر حسین ہے۔ ضلع جہلم کے ایک گاؤں چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔ ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم سے پائی۔ گورنمنٹ کالج کیسبل پور (ایک) سے ایف اے کیا اور بی اے کی ڈگری اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد صحافت کے کوچے میں قدم رکھا اور مولانا چراغ حسن حسرت کے اخبار ”شیراز“ میں بطور معاون مدیر کام کرتے رہے۔ بعد میں ایک فوجی اخبار کے عملہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ وہاں سے فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ میجر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

سید ضمیر جعفری نے مزاحیہ شاعری میں زندگی کی ناہمواریوں کو آشکارا کرنے اور تاثر کی شدت سے اصلاحی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ہاں زندگی کو اعتنا کی نظر سے دیکھنے اور اس کی حالت بدلنے کا انداز نمایاں ہے۔ اُن کے منتخب کردہ موضوعات پھول کی طرح کھلتے اور بے ساختہ مسکراہٹ کو جنم دیتے ہیں۔

تصانیف: قریہ جان، مانی الضمیر، مسدس بد حالی، کثر شیر خان، کتابی چہرے، من میلہ وغیرہ۔

Not For Sale

یہ سڑکیں

سید ضمیر جعفری

زمیں پر آدمی کی اوٹلیں ایجاد یہ سڑکیں پرانے وقت کے بغداد کی اولاد یہ سڑکیں
مرمت کی حدوں سے زائد المیاد یہ سڑکیں ہمارے شہر کی مادر پدر آزاد یہ سڑکیں
بظاہر صید، لیکن اصل میں صیاد یہ سڑکیں

دم باران رحمت گرد کا گرداب ہو جانا گڑھوں کا پھیل کر تالاب در تالاب ہو جانا
پھر کر نالیوں کا ”رستم و سہراب“ ہو جانا محلے کے گلی کوچوں کا زہرہ آب ہو جانا
مہینوں تک برنگ ہرچہ بادا باد یہ سڑکیں

بہرگامے سڑک کھا جانے والی کھائیاں دیکھو چنچنے راستوں کی ٹوٹی انگڑائیاں دیکھو
کھڑی اونچائیوں کے پیٹ میں گہرائیاں دیکھو گڑھوں کی جا بجا بہزادیاں، چغٹائیاں دیکھو
نقوش مانی و چغٹائی، و بہزاد یہ سڑکیں

ہم ان سے حلم و صبر و شکر کا پیغام لیتے ہیں کہ جب چلتے ہیں کم از کم خدا کا نام لیتے ہیں
یہ کام آئیں نہ آئیں ہم انہی سے کام لیتے ہیں ”گلوں سے خار بہتر ہیں، جو دامن تھام لیتے ہیں“
ہم ان سے مطمئن ہیں اور ہم سے شاد یہ سڑکیں

نظم میں شری سڑکوں کا نقشہ کس طرح کھینچا گیا ہے؟

نظم "یہ سڑکیں" کا خلاصہ لکھیں۔

تجربے سے مراد شاعری میں کسی تاریخی واقعے یا کردار کا ذکر ہوتا ہے، اس نظم میں شاعر نے کون کون سی

تسمیحات بیان کی ہیں؟

مصرعے کی وضاحت کریں:

پرانے وقت کے بغداد کی اولاد یہ سڑکیں

درج ذیل کے چار چار ہم قافیہ الفاظ لکھیں۔

ایجاد، گرداب، عمر، قعر، خار۔

"گھوٹ سے خار بہتر ہیں، جو دامن تمام لیے ہیں"

شاعر نے یہ مصرع وادین میں کیوں لکھا ہے؟ وضاحت کریں۔

مخمس:

جس نظم کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں، اُسے "مخمس" کہتے ہیں۔

مرزا محمود سرحدی

وفات: ۱۹۶۸ء

پیدائش: ۱۹۱۴ء

مرزا محمود سرحدی پشاور میں پیدا ہوئے۔ وہ اوائل زندگی ہی سے غم روزگار کے چکر میں پڑ گئے۔ انھیں زندگی گزارنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے۔ فوجی نوکری سے لے کر اسکول میں مدرسہ تک اور نوکری سے مزدوری تک کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔

انھوں نے اکبر الہ آبادی کے طنزیہ و مزاحیہ انداز کی تقلید کی ہے اور اسی وجہ سے انھیں "اکبر سرحدی" بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا کے مزاح میں لفظوں کی ہیرا پھیری نہیں ملتی، بلکہ اُن کا مزاح ایک حقیقت پسند کا مزاح تھا، جو وہ حالات و واقعات اور اُن کے نتائج سے پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے، جس میدان کا انتخاب کیا، وہ فن کے اعتبار سے دشوار ترین رہ گزار سے کم نہیں۔ طنز اور مزاح کی تمام تر لطافتوں کو برقرار رکھتے ہوئے انتہائی مختصر پیرائے میں جامع اور مکمل بات کا اظہار کرنا بے حد مشکل کام ہے، اس میں ایک طرف شاعر سنجیدگی سے دامن بچاتا ہے، تو دوسری طرف پھلکو پن کی حدود سے دُور رہتا ہے۔

مرزا محمود سرحدی نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی، لیکن اُن کا اصل میدان "قطعات" ہیں۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے معاشرتی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنے قطعات میں سمویا ہے۔ مثلاً: پوری، رہزنی، ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی، ملاوٹ، جھوٹ اور مکرو فریب وغیرہ۔ ان کا طنز سماجی ناسوروں کے لیے کسی نشتر سے کم نہیں۔ مرزا محمود سرحدی نے ساری عمر شادی نہیں کی زندگی کے آخری ایام میں دس کے مرض کی وجہ سے علیل رہنے لگے تھے۔ انھوں نے پشاور میں وفات پائی۔

مجموعہ ہائے کلام: سنگینے، اندیشہ، شہر۔

کبھی تو ان کی حسیوں سے شکل ملتی ہے
خدا کی شان ہے، وہ ہیں مرے وطن کے جوان
کبھی پناہ گزینوں سے شکل ملتی ہے
کہ جن کی پردہ نشینوں سے شکل ملتی ہے

کیا بتائیں آپ کو کیا ہے ہمارا ہسپتال
حادثاتِ اتفاقی کا بھی ہے اک ڈاکٹر
انتظام ایسا کہ بس دل کی کلی کھل جائے ہے
اتفاقی طور پر مل جائے، تو مل جائے ہے

اگر کوچوں میں بھنگی رات کو جاروب گش پاؤ
غلاقت جس سڑک پر جا بجا بکھری ہوئی دیکھو
تو جانو یہ بھی ہے اک شانِ بیداری کمیٹی کی
تو سمجھو اس طرف سے گزری ہے لاری کمیٹی کی

کالے چشمے بھی ایک نعت ہیں
جو نگاہیں ملا نہیں سکتے
دھوپ میں خوب کام دیتے ہیں
رات دن ان سے کام لیتے ہیں

مختب سے کہوں، تو کیا جا کر میری مانند وہ بھی روتا ہے
پہلے ہوتا تھا دودھ میں پانی آج پانی میں دودھ ہوتا ہے
(اندیشہ شہر)

- ۱- شاعر کو نو جوان نسل سے کیا شکایت ہے؟
- ۲- ان قطعات میں کن معاشرتی برائیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔
- ۳- مصرعے مکمل کریں۔

- (۱) انتظام ایسا کہ بس.....
- (ب) اگر کوچوں میں بھنگی رات کو.....
- (ج) کالے چشمے بھی.....
- (د) آج پانی میں.....

۴- جملوں میں استعمال کریں:

دل کی کلی کھلنا۔ نعت۔ نگاہیں ملانا۔ مختب۔ مانند۔

- ۵- قطعہ کے کہتے ہیں؟ کسی شاعر کا قطعہ لکھیں جس میں شگفتہ پیرائے میں کسی سماجی برائی کا ذکر کیا گیا ہو۔

ہدایت برائے اساتذہ

طلبہ کو اقبالؒ اور اکبر کے چند قطعات لکھوائیں۔

اخلاص

ہم دوش خُریا ہے مقامِ اخلاص
جو ملتا ہے ، ملتا ہے غلامِ اخلاص

گو فرش سے تا عرش سفر ہے دشوار
طے کرتی ہے بہ یک جُنبش گامِ اخلاص

فانی ہے ہر اک چیز، ہر اک رسم و رواج
باقی ہے، مگر ایک دوامِ اخلاص

اسلام ہے پابندیِ اخلاص کا نام
اور نام ہے اسلام کا نامِ اخلاص

صیاد کو ممکن ہے ہما ہاتھ لگے
پھیلائے محبت سے جو دامِ اخلاص



عبدالرحمن بابا

وفات: ۱۱۷۷ھ

پیدائش: ۱۶۵۳ء

سترہویں صدی پشتو زبان و ادب کا دورِ زریں تھا۔ اس عرصے میں پشتو زبان و ادب کے بے شمار مستند اور معتبر شاعر و ادیب گزرے ہیں۔ جن میں خوشحال خان خٹک، عبدالحمید مومند، عبدالقادر خٹک، اشرف خان بھری اور معزاللہ مومند کے ساتھ ساتھ عبدالرحمن بابا قابل ذکر ہیں۔ عبدالرحمن بابا نے ساری زندگی اپنے آبائی گاؤں (بہادر کله) ہزارخوانی پشاور میں گزاری۔ اُن کی شاعری پر فطرت اور حقیقت کا رنگ غالب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے کے شاعر ہیں۔ اُن کے اشعار میں ماضی کی تاریخ، حال کا تذکرہ اور مستقبل کا پیغام جھلکتا ہے۔ اُن کا دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن علم و ادب کے لحاظ سے جامع اور مکمل ہے۔ پختون فطرت کی ترجمانی جس طرح عبدالرحمن بابا نے کی ہے کسی اور شاعر نے نہیں کی۔ اسی لیے جو مقبولیت اُن کو حاصل ہے، کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کے اشعار نہ صرف عشقِ حقیقی اور تصوف کے آئینہ دار ہیں، بلکہ ابدی زندگی میں کامیابی کے لیے پند نامہ بھی ہیں۔ قرآن و احادیث کی تشریح و توضیح اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اُن کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے دیوان کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں اور لوگ اُن کی تعلیمات سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اُن کی شاعری کے موضوعات محنت کی عظمت، رزقِ حلال، اسلامی اصول، علم کی اہمیت و افادیت اور دنیا کی بے ثباتی جیسے حقائق پر مبنی ہیں۔

مجموعہ کام: دیوان عبدالرحمن بابا

حاجت نہیں اخلاص کی کچھ بعد فنا
قام کرو ہستی میں نظامِ اخلاص

شریخی گفتار پہ حیرت کیسی
ہے گفتہٴ رحمن کلامِ اخلاص

(ستارہ فقیر)

مشق

۱۔ اس نظم میں "اخلاص" کی جو تعریفیں بیان کی گئی ہیں، انہیں مختصراً لکھیں۔

۲۔ "ہم" پرندے کی کیا خصوصیت بیان کی جاتی ہے؟

۳۔ اخلاص کی وجہ سے کون سا سفر آسان ہو جاتا ہے؟

۴۔ اس نظم کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۵۔ نئی ہے اب تجھے اب رسم و رواج

باقی ہے، مگر ایک دوامِ اخلاص

کلام میں دو ایسے الفاظ استعمال کرنا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں "صعوبت تضاد" کہلاتا ہے۔ جیسے مندرجہ بالا شعر

میں "نئی" اور "باقی" ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ صعوبت تضاد کی تعریف کریں اور تین مثالیں لکھیں۔

طلبہ کو عبد الرحمن بابا کے چند ضرب المثل اشعار سنائیں۔

حالات کے امتحان

میر تقی میر



وفات: ۱۸۱۰ء

پیدائش: ۱۷۲۱ء

میر تقی میر کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین نے میر کو تنویط کا حامل شاعر بھی کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر تقی میر کا تخلیقی شعور زندگی کی مایوسیوں کی نشان دہی کر کے بھی گم کر دینے والی یاسیت کی منزل سے نہ صرف فاصلے پر ہوتا ہے، بلکہ زیر سطح ایک نشاطیہ احساس کو جگانے کا باعث بھی بننا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معترف شاعرانے میر کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ غالب جیسے یگانہ روزگار شاعر نے برملا یہ کہا:

رہینے کے تھیں استاد نہیں ہو غالب

کتنے ہیں اچھے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میر کا اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود قدرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کے کلام میں روزمرہ اور محاورے کا التزام بخوبی موجود ہے۔ ان کے عہد کو اردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو چھٹے ضخیم مجموعہ ہائے کلام دیے، جن کی قدر و قیمت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ گویا میر تقی میر کا یہ دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا ہے:

میر کا نام ہے بول میں چھایا ہوا

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تصانیف: مجملہ دیوان (اردو)، دیوان میر (فارسی)، ذکر میر (خودنوشت) اور نکات الشعراء (تذکرہ)

Not For Sale

160

میر تقی میر

غزل

فقرانہ آئے صدا کر چلے
میاں! خوش رہو ہم دُعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ! جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کر کے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
جیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حق بندگی ہم ادا کر چلے
پڑہش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے

(انتخاب کلام میر)

Not For Sale

161

غزل

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو روئے
اب صبح ہونے آئی ہے ، اک دم تو سوئے

اخلاص دل سے چاہیے سجدہ نماز میں
بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئے

کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم گشاں
اس آب گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئے

اب جان جسم خاک سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئے

آلودہ اُس گلی کے جو ہوں خاک سے تو میر
آب حیات سے بھی نہ وے پاؤں دھوئے

(انتخاب کلام میر، ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

مشق

۱۔ درست الفاظ کا انتخاب کریں۔

(۱) ہر شعر میں مصرعے ہوتے ہیں۔

• دو • چار • تین • پانچ

(ب) غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں۔

• ردیف • بیت الغزل • مقطع • مطلع

(ج) غزل کے میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

• مطلع • مقطع • درمیان • آغاز

(د) میر کو کہا گیا۔

• خدائے سخن • بابائے اردو • بلبلِ بند • اردو غزل کا باوا آدم

(۲) غزل کے تمام اشعار کا مفہوم ہوتا ہے۔

• الگ الگ • ایک • تضاد • مبارک

(۳) میر کی غزل کا بنیادی موضوع ہے۔

• غم • شک • خوشی • حس



خواجہ میر درد

وفات: ۱۷۸۵ء

پیدائش: ۱۷۲۰ء

خواجہ میر درد دہلی میں پیدا ہوئے۔ گو تصوف کے مضامین اُردو کے بیشتر شعرا نے باندھے ہیں لیکن ان میں جو تکمیلی شان درد نے پیدا کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ صوفی تھے۔ درد قلبی واردات کے اظہار کے لیے جن الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ الفاظ بنے ہی اس مقصد کے لیے ہوں۔ درد کی صوفیانہ شاعری وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفوں کا خوب صورت امتزاج پیش کرتی ہے۔ خواجہ میر درد تصوف کے فلسفیانہ مضامین کو جس بے ساختگی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں، وہ انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اُن کی غزل میں تغزل صرف تصوف کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ درد کے ہاں عشق اور تصوف ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں۔ انھوں نے محاورہ اور روزمرہ کثرت سے استعمال کیا اور نہ صرف غزل کی تہذیبی روایت پیدا کی بلکہ اسے ارتقا کے اگلے زینے پر چڑھنے کا راستہ بھی دکھایا۔ اُردو شاعری کو درد نے ایک ہی مجموعہ کلام (دیوان درد) دیا ہے لیکن معیار کے اعتبار سے وہ اتنا بلند پایہ ہے کہ اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جس نے درد کو غزل گو شعرا کے صفِ اوّل میں کھڑا کر دیا ہے۔

تصانیف: شمع محفل، آہ سرد، نالہ درد، واردات، درد دل اور علم الکتاب

۲۔ کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے
میری غزل کے اس مقطع کی تشریح کریں نیز یہ بھی واضح کریں، کہ اس میں علم بیان کی کون سی خوبی پائی جاتی ہے؟

۳۔ مندرجہ ذیل مصرعوں کے ساتھ دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کریں۔

- (۱) غم نہ آئے صد آہیں
- (۲) وہ یہ چیز ہے آہ جس کے لیے
- (۳) دکھائی دیے ہیں۔ بے خود کیا
- (۴) پرستش کی دیں تک کہ اسے بت گئے
- (۵) کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر

۴۔ میر کی شاعرانہ خصوصیات پر نوٹ لکھیں۔

غزل کی تعریف:

غزل کا لفظ عربی زبان کا ایک مصدر ہے۔ جس کے معنی ”کاتا“ (چرنے پر روئی سے سوت ”دھاگہ“ بنانا) ہے۔ ادب کی رو سے غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کے حسن جمال کی تعریف کرنا۔ غزل نظم کی ایسی صنف ہے جس میں عشق و محبت (حقیقی و مجازی) کا ذکر ہوتا ہے۔ غزل کے کم از کم اشعار کی تعداد پانچ اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

غزل

قل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شع کے منہ پہ جو دیکھا ، تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحا ، لیکن
میں جو پہنچا تو کہا ، خیر یہ مذکور نہ تھا
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
واں پہ پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
پردش غم کی ترے یاں تیں تو کی ، دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا
مختب آج تو مے خانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی، کہ شیشے کی طرح پور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار! کیوں ماننا۔۔۔
اس کو کچھ اور سوا دید کے، منظور نہ تھا۔

(یوان درد مرتبہ نثار الرحمن داؤدی)

مشق

- ۱۔ خالی جگہ مناسب لفظ کے انتخاب سے پُر کریں۔
(ا) قل عاشق کسی..... سے کچھ دور نہ تھا (ممشوق ، محبوب ، دشمن)
(ب) رات مجلس میں ترے..... کے شعلے کے حضور (آگ ، حسن ، ناز)
(ج) واں پہ پہنچا کہ..... کا بھی مقدور نہ تھا (انسان ، آدمی ، فرشتے)
(د) مختب آج تو..... میں تیرے ہاتھوں (تھانے ، نیل خانے ، مے خانے)
(ه) درد کے ملنے سے اے..... بُرا کیوں مانا (یار ، دوست ، دشمن)
- ۲۔ ردیف کے کہتے ہیں؟ اس غزل کی ردیف کی نشان دہی کریں۔
- ۳۔ دور، دستور، مذکور وغیرہ اس غزل کے قافیے ہیں۔ ایسے پانچ ہم قافیہ الفاظ لکھیں جو اس غزل میں موجود نہ ہوں۔
- ۴۔ کنایہ قریب اور کنایہ بعید میں، مثالوں کی مدد سے فرق واضح کریں۔
- ۵۔ اس غزل کے قوافی لکھیں۔
- ۶۔ مندرجہ ذیل کی تعریف کریں اور دو دو مثالیں لکھیں۔
مرامۃ الطیر، حسن تلیل، لف و نشر، تلیج، تنسین۔
- ۷۔ آپ کو اس غزل میں درد کا کون سا شعر پسند ہے اور کیوں؟

غزل

نامہ چن میں جب وہ گل اندام آگیا
گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا
اٹھا جو صبحِ خواب سے وہ مست پر خمار
خورشیدِ گف کے بیچ لیے جام آگیا
افس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آگیا
ہے جائے رحمِ حال پہ یاں اُس اسیر کے
جو گرتے ہی ہوا سے تہہ دام آگیا
سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں
دو دن ، اگر کسی کے کوئی کام آگیا
کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفی ؟
گر صبح کو گیا ، وہیں پھر شام آگیا



شیخ غلام ہمدانی مصحفی

وفات: ۱۸۴۴ء

پیدائش: ۱۷۵۱ء

مصحفی کی غزل دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے دل آویز امتزاج کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اُن کی غزل میں ایک طرف دبستانِ دلی کا سوز و گداز ہے تو دوسری جانب دبستانِ لکھنؤ کی پیکر تراشی کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔
مصحفی کا اسلوب نہایت سلیس، بے حد سادہ اور تخلیقی نفاست کا حامل ہے۔ اُن کے لہجے میں ایک دھیما پن اور ٹھہراؤ ہے جو اُن کی غزل میں ایک طلسماتی فضا پیدا کرتا ہے۔ مصحفی کو غزل پر ایک استادانہ کمال حاصل ہے۔ وہ پائمال موضوعات کو بھی نئے انداز سے برستے ہوئے اُن میں کوئی نہ کوئی جدت کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ان کے کئی ایک اشعار کو ضربِ المثل کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ”حیات“ میں لکھا ہے کہ ”یہ اصول فن سے بال برابر بھی سرکتے نہ تھے۔ کلام پر قدرتِ کامل پائی تھی۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس دروبست سے شعر میں کپاتے تھے، کہ جو حقِ استاد کی کاہے ادا ہو جاتا تھا۔“
مصحفی کی غزلیات میں روانی اور جوانی پائی جاتی ہے۔ وہ صحتِ زبان کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں ترنم پایا جاتا ہے اور یہ کیفیت سوزوں و اصوات کی تکرار سے پیدا ہوتی ہے۔

مشق

- ۱۔ مصحفی کی شامل نصاب غزل میں جوڑ ایک استعمال ہوئی ہیں انھیں تحریر کریں۔
- ۲۔ مصحفی کی غزل میں ردیف اور قافیوں کی نشان دہی کریں۔
- ۳۔ اس غزل میں سے چند مرکبات اضافی لکھیں۔
- ۴۔ ان مصرعوں کا مفہوم واضح کریں۔
 - گل بہشت رنگ کا پتہ نہ دیا
 - نہ ریشہ گاہ کے لیے چہ نہ آگیا
 - نہ گرتے نہ ہواتے تہہ دام آگیا
- ۵۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔
 - گل اندام، پشاور، آفت، تہہ دام، ایسہ، آفتاب عمر۔
- ۶۔ مصحفی کی غزل کے دوسرے شعر میں جس صنعت کا استعمال ہوا ہے، اس کی تعریف کریں اور دو مثالیں دیں۔

شعر:

وہ کلام موزوں جو بامقصد ہو، ایک خیال کو ظاہر کرے اور جس کے دونوں مصرعے ایک ہی وزن میں ہوں ”شعر“ کہلاتا ہے۔



مرزا اسد اللہ خان غالب

پیدائش: ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء وفات: ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء

مرزا اسد اللہ خان غالب آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اسد اور بعد میں غالب تخلص اختیار کیا۔ شاہی دربار سے نجم الدولہ اور دبیر الملک کے خطاب پائے۔ غالب کے آباؤ اجداد ترک سلجوق تھے جو مغلیہ عہد میں ماوراء النہر سے ہندوستان آئے اور اچھے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے چچا نصر اللہ بیگ شاہی فوج میں رسالدار تھے۔ نوابان لوہارو سے مرزا غالب کا سسرالی رشتہ تھا۔ اپنی خاندانی وجاہت پر انھیں ناز تھا:

سو پست سے ہے پیشہ آبا پہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

اپنی شعر گوئی کے پہلے دور میں غالب نے مشکل پسندی اختیار کی لیکن پھر سادہ طرز اپنایا۔ خیال کی لطافت، بلندی، روزمرہ اور محاورات کا لطف، طرزِ ادا کی شوخی اور موضوعات کی رنگارنگی نے ان کے کلام کو منفرد اور دلکش بنادیا۔ زندگی کے غموں اور دکھوں کے باوجود وہ خوش طبعی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خوبی محاکات ہے۔ وہ لفظوں سے تصویر کھینچ کر دکھاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا انتخاب ”دیوان غالب“ کی شکل میں کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت میں اس انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ اردو کا یہ عظیم شاعر دہلی میں انتقال کر گیا۔

تصانیف: دیوان غالب، اردوئے معلیٰ، غود ہندی، لطائف غیبی، کلیات غالب (فارسی)، قطع برہان، دستنبو وغیرہ۔

غزل

صلوات کا بلبل

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مگڑ نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عفویت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتے میں بہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منج قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے، جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اس کی گردن پر؟
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھریوں دم بہ دم نکلے
نکلتا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طُرّہ پر بیچ و خم کا بیچ و خم نکلے
ہوئی جن سے توقعِ خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(دیوان غالب)

۱۔ کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ دساغ نہیں ہوں میں

غالب کے اس شعر کی تشریح کریں نیز یہ بتائیں کہ اس میں علم بیان کی کون سی خوبی پائی جاتی ہے۔

۲۔ مندرجہ ذیل مصرعوں کا مفہوم واضح کریں۔

(۱) لوحِ جہاں پہ حرفِ کمرز نہیں ہوں میں

(ب) رتبے میں میر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں

(ج) وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

(د) بہت نکلے میرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

(۵) اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کا فر پہ دم نکلے

۳۔ غالب کی پہلی غزل کی ردیف تحریر کریں۔

۴۔ غالب کی دوسری غزل کے قافیوں کی نشان دہی کریں۔

۵۔ آپ کو غالب کا کون سا شعر زیادہ پسند ہے اور کیوں؟

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

تلفِ نمر - غل ازم - میر و ماہ - کمر - غنوت - گردشِ مدام - بھرم کھلنا - چشم تر۔

۷۔ غالب کے کلام کی نمایاں خصوصیات تحریر کریں۔

داغ دہلوی



وفات: ۱۹۰۵ء

پیدائش: ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء

نواب مرزا خان داغ دلی میں پیدا ہوئے۔ قلعہ معلیٰ میں پرورش پائی۔ قلعہ میں مشاعروں کی رونق کو داغ نے قریب سے دیکھا اور یہیں سے ان کا ذوقِ شاعری اُبھرا اور انکھرا۔ شاعری میں استادِ ذوق کے شاگرد تھے۔

داغ کے یہاں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ لطفِ محاورہ اور زبان کا چٹخارہ ہے۔ اُن کا اندازِ بیان بڑا خوبصورت ہے۔ داغ کی غزلوں میں عشق کی معاملہ بندی، شوخی اور مسرت کے جذبات کی فراوانی ہے۔ ان کی شاعری میں میر کا غم یا غالب کا غور و فکر نہیں ہے مگر ان کا اندازِ بیان سہل ممتنع کی بہترین مثال پیش کرتا ہے جس کی بدولت ان کی شاعری کو ایک خاص مقام حاصل ہوا ہے۔ ان کی زبان کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال بھی انھیں اپنا کلام اصلاح کے لیے ارسال کیا کرتے تھے۔ ان کی موت پر اقبال نے ایک پُر تاثیر مرثیہ لکھا جس میں داغ کی شاعری کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اُردو غزل کی تاریخ میں داغ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں بھی ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہے۔ داغ کا کلیات اردو شاعری کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔

مجموعہ ہائے کلام: ماہتابِ داغ، گلزارِ داغ، آفتابِ داغ اور یادگارِ داغ، داغ دہلوی کے نمائندہ شعری مجموعے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔

غزل

آئینہ اپنی نظر سے نہ جدا ہونے دو
کم نگاہی میں اشارہ ہے، اشارے میں حیا
ہم بھی دیکھیں، تو کہاں تک نہ توجہ ہوگی
آنکھ ملتے ہی کہوں خاک حقیقت دل کی
تم دل آزار بنے رشک مسیحا کیسے
کیا نہ آئے گا اسے خوف مرے قتل کے بعد

کوئی دم اور بھی آپس میں ذرا ہونے دو
یا نہ ہونے دو مجھے چین سے یا ہونے دو
کوئی دن تذکرہ اہل وفا ہونے دو
دیکھ کر جلوہ مرے ہوش بجا ہونے دو
کم نہ ہونے دو مرا درد سوا ہونے دو
دست قاتل کو ذرا دستِ دُعا ہونے دو

جب سنا داغ کوئی دم میں فنا ہوتا ہے
اس شکر نے اشارے سے کہا: ہونے دو

(کلیات داغ)

مشق

۱۔ موزوں الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

- (ا) آئینہ اپنی سے نہ جدا ہونے دو (نظر۔ جگر۔ اثر۔ سفر)
(ب) ملتے ہی کہوں خاک حقیقت دل کی (بال۔ ہاتھ۔ آنکھ۔ ناک)
(ج) جب سنا کوئی دم میں فنا ہوا ہے۔ (میر۔ درد۔ ذوق۔ داغ)
(د) تم دل بنے رشک مسیحا کیسے (آرام۔ آزار۔ آویز۔ افروز)
(ه) اس شکر نے سے کہا ہونے دو۔ (اشارے۔ شرارے۔ ستارے۔ نظارے)

۲۔ داغ دہلوی کی غزل کا مطلع تحریر کر کے اس کا مفہوم واضح کریں۔

۳۔ داغ نے غزل کے مقطع میں محبوب کی نفسیات کی کون سی تصویر پیش کی ہے۔

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

کم نگاہی، حیا، رشک مسیحا، دستِ دعا، اہل وفا، فنا۔

۵۔ داغ کی شاعری پر مختصر نوٹ لکھیں۔

ہدایات برائے اساتذہ

داغ دہلوی علامہ اقبالؒ کی شاعری کے استاد تھے۔ آپ طلبہ کو تفصیل سے آگاہ کریں۔

فرہنگ

اپنی مدد آپ

معنی	الفاظ	معنی
پیشوں	فیلوفوں	فلسفہ جاننے والے۔ دانشمندیوں
پینال۔ پن سال	پانی ٹپکنے کے لیے بنا ہوا سوراخ	خزانے کا سانپ، دولت مند کنبوس
نیت و تابود	پانکھ ختم کرنا۔ بنیاد ڈالنا	مستقل مزاج، مضبوط
حاشا و کھا	خدا نہ کرے، ہرگز نہیں	آپا و اجداد، باپ دادا۔
	پرکھوں	

جھوٹے آدمی

معنی	الفاظ	معنی
دروغ گو را حافض	مکات نفسانی	جھوٹے آدمی کا حافض نہیں ہوتا
نہ باشد	متمکن	جھوٹے آدمی کو بات یاد نہیں رہتی
نچ پیار	مٹنچ	کاہ و بار خیر و فروخت
قوائے عقلیہ	قلعی کھل جانا	عقل کی قوتیں
کودون	جنگ زرگری	اتق، نودان
اختراع	صلح کل	نئی بات نکالنا
چسکا	نطق	مزاج، عادت
گوشتی	کذب	کان بھینچنا، مزادینا
تعلقی	گھڑنا	اپنی بات بیان کرنا
		اپنی طرف سے بات بنانا،

Not For Sale

نظریہ پاکستان

معنی	الفاظ	معنی
برابری	مساوات	اگ لگ
مسل	پیہم	رواج دینا
بے دینی	الحاد	عادت
فرق	اتیاز	دوست
مضبوط	توانا	دشمنی
بد نظمی	انتشار	پھوٹ/دشمنی
اجتماع/اکٹھ	جمعیت	راضی نامہ
خیال	قیاس	مضبوط

پاکستانی قومیت کا مسئلہ

معنی	الفاظ	معنی
یکپل بھوانا	یو جھ بھارت	ڈھنگ، طور، طریقہ
تخریر کرنے والا	محرر	جس کی کوئی تعبیر ہو، جس پر عمل ہو سکے
گمان کرنا، خیال کرنا	محمول کرنا	تکرار کرنا، جھگڑا کرنا
انتظام درہم برہم کرنا	شیرازہ منتشر کرنا	قومیت کی بنیاد پر طرف داری

Not For Sale

کچھ ادب کے بارے میں

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
مشائگی	بہاؤ سنوارنا، حسین بنانا	پیدائش	آفرینش
تغیرات و انقلابات	جدید	چشمہ جاری ہونا	سوتا پھوٹنا
مد و جزر	جوار بہاؤ، پانی کا اتار چڑھاؤ	دریا / سمندر کی موجوں کا جوش	سلاطم
بادِ موسم	بہت گرم ہواؤ	دنیا پر ظاہر ہونا، مشہور و معروف	عالم آشکارا
صناعانہ	کارگران، ہنرمندی سے	طبیعت کی آٹھان	افتخارِ طبع
منقش	ناراض، رنجیدہ	نیا آنے والا	نو وارد
مشنگی	پاکیزگی، صفائی		

لحمہ فکریہ

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
وطن عزیز	پیارا وطن، مراد پاکستان	شرح	شرح
مالا مال	دولت مند، بھرا ہوا	معیار	معیار
حتیاج و	اپنا حصہ سے بڑھنے والا	سکڑنا	سکڑنا
ڈیرے ڈالنا	ربائش کر لینا	منصوبہ ساز	منصوبہ ساز
تحفظ	حفاظت	گامزن	گامزن
فقدان	نہ ہونا، کمی	نجی	نجی
خواندگی	پڑھائی / لکھنے پڑھنے کی قابلیت	رد و اداری	رد و اداری
عوامل	عالمی سطح واقعات	اقدار	اقدار

داروغہ جی کی پانچوں گھی میں اور سرکڑا ہی میں

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
دھکارتا	راندے جانا	منت سماجت کر کے	درچوم کے
غلام	گلام	خداوند	کھداوند
جہاں ظلم ہو وہاں حکومت نا کام ہو جاتی ہے۔	اندھیر گھری چو پٹ راجا / راج	ایک نمبر مال، اعلیٰ درجے کا مال	اڈل مال
کوئی پوچھے والا نہ ہو	بکھیرا	عقل دوڑانا، قیاس کرنا	گدے بازیاں
جنجال، جھنجھٹ، مصیبت	گرج	یکشت بتادو	کٹھڑی بتادو
یہاں مُراد غرض	لکھ لٹ	کانٹ چھانٹ	کتر پیونٹ
لاکھوں روپے لٹانے والا	کور نمک	لختِ ملامت	پھنکار
نمک حرام	ساجھا	مال کا دودھ، جائز، حلال	بیر مار
شریک، شراکت	دست پناہ	ایک نشہ آور بوٹی	بھگ
چٹا	نکلر گدا	قری مینے کی دوسری تاریخ	دوج
بھکاری	قرولی	بے عزت، بے غیرت	گیدی
شکاری چاقو	کچا چٹھا جڑنا	حقیر آدمی، نا کارہ	مردک
صحیح صحیح حال بنانا	چہرہ شاہی	نیکی کا بدلہ بدی میں ملنا	الٹی آنتیں گلے پڑنا
سرکاری سکہ جس پر بادشاہ کی تصویر ہو	رقم پیرنے	دن کا پہلا سودا	بونی
پیسے جمع کرنے / اٹھانے کے لیے	کچھریل	خیر چھاپنا، تشہیر کرنا	پرچہ جڑنا
کچھروں سے بنائی چھت	نیاریا	چالاک، مکار	کانیاں
چالاک، جزس	ٹیڑھی کھیر	شروع میں روکنا	ہتھے پر ٹوکنا
مشکل کام			

آنگن

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
مشکوٰۃ، وہ جس کا مطلب صاف نہ ہو	مبہم	گھبرا جانا، ہواس باختہ ہونا	چھلچھوٹا
مٹی کے بڑے ٹکڑے	ڈھیلے	صحن	آنگن
بھیس بدلنا، قریب دینا۔	سوانگ رچانا	آن بان، شان و شوکت	ٹھٹھا
		احسان مندی	منونیت

خوب صورت بلا

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
بحث مباحثہ، تکرار	قیل و قال	دشمنی، کینہ، بغض	عداوت
رعب و دبدبہ	جلال	ہاتھ باندھے، موڈب	دست بستہ
بلندی کی نشانی	عروج مانند	ساتھی، دوست	ہدم
آسمان	سپہر	حفاظت کرنے والا	محافظ
دروازے پر پہرہ دینے والا	در بان	نوکر، غلام	چاکر
تعریف بیان کرنے والا	شنا خواں	کھیاں اڑانے والا، پتکھا جھلے والا	گس رال
بادل	سحاب	قسمت بدوگار	بخت یاور
عزت، مرتبہ، بلند مقام	وقار	گہرا سمندر	قلزم

ایسا، ویسا

چینس و چننا

ہاتھ لگنا

ہتھے چڑھنا

جادو کے اثر میں مبتلا شخص

بیدھا

بات بے مٹی ہونا

مطلب خط ہونا

اجازت نہیں

سند نہیں

گڑبڑ کرنا، ادھر ادھر کرنا

بے تے کرنا

کھل طور پر

چنے جھاڑ کر

تین افراد کا گٹھ جوڑ

مگرم

گالیاں دینا، برا بھلا کہنا

صلواتیں سنانا

ایک قسم کی شرط (toss)

چپٹ

مار کھانا، بے عزت ہونا

بے بھاد کی پڑنا

تھمر مارے گئے

دھپائے گئے

گدھے جیسا حقیر

مردک خر

بے کار

گھاس نہیں چھیلا

گالیاں بکنا

لام کاف بکنا

ناراض ہونا، غصے میں آنا

آنکھیں نیلی کرنا

فساد ڈالنا

مینڈھے لڑانا

بیان لینا

اظہار لینا

چوچوے مزاج آدمی

جھلے آدمی

کب تک ایسا ہوگا

تا کے باشد

اڑنے کے لیے پر تول کر رہ جانا

کندے تول کر رہنا

جسمانی توانی، مارو حاز

لپاؤ گی

پریشان ہو جانا

ہوائیاں اڑنا

بھڑا کرنا، تکرار کرنا

چیں چڑ کرنا

بغیر محنت کے فائدہ اٹھانا

تلوہ اڑالے

اتق، تادان

گاؤ دی

بر کی جمع، مجید، راز

آسرار

بزاروئن دان یا سورار

موکھا

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

ازخس موئے بس

بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا

چھٹی کا دودھ یا آنا

دغا فریب، بددیانتی

خدا م	خدا کی جن	بلائے ناگہانی	اچانک نازل ہونے والی مصیبت
پت	بے حیثیت، حقیر	اثر در	اثر دہا، بہت بڑا سا پ
طینت	نظرت، پختہ عادت	عصمت	پاکیزگی

تعلیم بالغاں

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شکت	بڑائی، بڑی بھون	گھڑوچی	گھڑی کا چوکھٹا جس پر گھڑے رکھے جاتے ہیں
گندہ	موٹی گھڑی کا گھڑا	دام اقبالہ	اس کا مرتبہ ہمیشہ بلند رہے
خورد و کلاں	چھوٹے بڑے	درگا و خداوندی	اللہ تعالیٰ کا دربار
جنگی	جھوپڑی	چچی	چلک دار شئی / چھڑی / شاخ
ازرا و رحمت	رحمت کرتے ہوئے	بریلی	ہندوستان کا ایک شہر جہاں کے باشندے مشہور ہیں
جملہ	تمام	ونگ (wing)	پر، طرف
گراٹ (grant)	حکومت کی جانب سے دی جانے والی امداد	کوائف	کیفیت کی غلط جمع، صحیح جمع کیفیات
گرومندری	کراچی کا ایک علاقہ	بیڑی سوت گیا	بیڑی بنی گیا
صدری	داسکت		

شیراز اور کنار آب رکناباد وغیرہ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شیراز	ایران کا ایک قدیم شہر	رکناباد	شیرازی ایک سیرگاہ
داتیں کاٹنا	مسواک کی گھڑی کاٹنا	چشم	بہرہ چشم، یعنی بہت اچھا

سعدی شیرازی کے قبر کی مٹی سے عشق کی خوش بو آ رہی ہے۔ اگر اس کے مرنے کے ہزار سال بعد بھی اسے سونگھو فرخ نوشیرواں کا نام زندہ ہے۔

زندہ است نام فرخ

نوشیرواں کھراگ نواح حافظ جناب، جھکڑا مضائقہ، ارد گرد کا علاقہ حفظ کرنے والا، یہاں مراد فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی ہے

نغیرنو شگفتہ

جشید منصور گئے دارا پانی چوانے والا پانی پکانے والا

بنیاد

کٹنا ہوا بازو، کٹنا ہوا تانہ سوستوں پر قائم محل

کارئیدور برآمدہ

قافلہ دزدان برسر

کوہے نشستہ بودند داخلی رفاقت پہنائی گل صد برگ دلی دوستی کشادگی، وسعت ایک پھول کا نام، سوچنیوں والا پھول

وکیل الرعایہ

تومان انا الحق کوس یدھ رعایہ کا وکیل، یہاں مراد رعایہ کا خادم ایرانی ہسکت بے شک میں حق ہوں تقریباً تین سو گز کا فاصلہ جنگ

اے آمدنت باعث

آبادی ما مسطح رفیع الشان مرتسم آپ کا آنا میرے لیے خوشی کا باعث ہے ہمہراز عظیم الشان نشان کیا گیا، مہر لگا یا گیا

مادر چہ خیا لیم	میں کس خیال میں ہوں اور	برادر بہ جان برابر	میری جان کے برابر میرا بھائی ہے۔
خاند زاد	آسمان کس خیال میں ہے۔	جمال	بوجھ اٹھانے والے (واحد جمالہ)
قربان نت شوم	غلام		
	تیرے قربان جاؤں		

رہزنده شہر، مردہ شہر

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اطالوی	اٹلی کا	لیپا پوتی	ٹل دینا، برش سے لگانا
قیلولہ	سستا، دوپہر کا آرام	مزا کا فور ہونا	مزا ختم ہو جانا
معنون	عنوان دیا گیا	قیصر	روم کے بادشاہوں کا لقب
بُقعہ نور	منور مقام	روستہ الکبریٰ	عظیم روم
ترکین	سجاست، آرائش	کھنڈر	ویران عمارت، ویرانہ
امراء عظام	عظیم بادشاہ	باندیاں	کنیریں، لونڈیاں

لاچی وزیر (ترجمہ)

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ریچو	بھینر کرکڑوں کا گھڑ	ضعیف الاعتقاد	کمزور عقیدہ رکھنے والا
ہولیا	ساتھ ہو کر روانہ ہو گیا	گڈر یا	بھینر کرکڑیاں چرانے والا
کھنے تہ کرے	کھنے سیت کر اتر کر کے بیٹنا	اسلوب	لکھنے کا انداز
دوزانو بیٹنا	کھنوں کے گل بیٹنا	لوک	روایتی

مکاتیب مرزا غالب

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
پیدا	خبر، اطلاع	طلانی لوح	مٹنے والی لوح
ہاترس (Hathras)	ہندوستان کے ریاست آگرہ میں ایک ضلع	مطبع	چھاپنے کا مکان
ڈزیک	دیر پزیر، تاخیر	زمرہ پرداز	گیت گانے والا
منہائی	کم کرنا، مگھنا		

قلمرو	حکومت، سلطنت، ملک	مہاجن	سود کا کاروبار کرنے والے، مراد ہندو
مجہد العصر	زمانے میں مانا ہوا اجتہاد کرنے والا	حکیم الملک	ملک میں مانا ہوا حکیم یا دان
قطب الملک	ملک میں مانا ہوا نیک آدمی	یوسف ہند	ہندوستان میں سب سے خوب صورت آدمی

مکاتیب اقبال

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مخدوم	جس کی خدمت کی جائے	نوازش نامہ	محبت نامہ، خط
عالمات	پیار، ناسازی	لسانی عصبیت	زبان کی طرفداری
دینی عصبیت	دین کی طرفداری	مستقر	ٹھکانا، مرکز، رہنے کی جگہ
رزم گاہ	میدان جنگ، عمل کی جگہ	پیشنگ سنٹر	اشاعت کا مرکز
طباعت	چھپائی، پرنٹنگ	صحرائیوں	صحرا میں رہنے والے
تردوات	پریشانیوں	سبحان اللہ	اللہ کی ذات پاک ہے، تعریفی جملہ
معنی آفرینی	معنی نکالنا، مطلب پیدا کرنا	دم زدن	سانس لینے کی
دکھڑا	دکھ کی باتیں	مقتض	سانس لینے والا، مراد انسان
مناصب	عہدہ، مرتبہ، منصب کی جمع	متاع	امانیہ، جمع پونجی، مال
خانوادے	خاندان	مجدد	تجدید کرنے والا، پرانے کو نیا کرنے والا
احیاء	حیات، زندگی، دنیا	احرار	خُرکی جمع، آزاد لوگ
منقود	ختم، غائب	اضطراری	بے چینی

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
عفت، بلندی	وجدان	دریافت، ذکاوت	معنی
کارگر، خالق	خلاق	تحقیق کرنے والا	معنی
خوش بو	ترنم	غنا، الپ، نفیسی	معنی
بلبل کی آواز، چیکنا، شادی کا شور	آیات	آیت کی جمع، نشانیاں	معنی

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
مقتل	مجل	مختصر، خلاصہ	معنی
ابد	طرہ دستار	گہلائی کا اوپری اور بلند حصہ	معنی
ازل	زخ انور	روشن چہرہ	معنی
راہ عدم	مشعل	بڑی شمع، بڑا چراغ دان	معنی
مداح	مستانہ قصیدہ	سرشار کرنے والا قصیدہ	معنی

شہر آشوب

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
لیل و نہار	موجودار	موجود والی	معنی
خلق	صراف / جوہری	سونے کا کاروبار کرنے والے	معنی
بچے	سیٹھ	امیر، دولت مند	معنی

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
ساہوکار	نہیب	مہاجن، روپے کا کاروبار کرنے والے	معنی
شرسار	فرسودگی	شرمندہ	معنی
ناہوگی	آسودگی	نہ ہونا	معنی
بہوگی	روہ گزر	فائدہ، نفع	معنی
کوڑی		سب سے چھوٹا سکہ، چھپا	معنی
مہر		محبت	معنی

شہزادے کا چھت پر سونا اور پری کے ہاتھوں اغوا ہونا

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
چاند	خلل	خرابی	معنی
اتفاق، چانک	سینیں	چاندنی جیسا	معنی
گال	منور	روشن	معنی

دُرِ مراد

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
شاوین	فُرس	دین کا بادشاہ مراد حضرت امام حسین	معنی
خلد بریں	کردگار	جنت	معنی
اونج زمین	راہوار	زمین کی اونچائی	معنی
نیزدیں	دُور مراد	دین کا سورج	معنی
ٹپے	مشہد امام	طبق کی جمع - زمین کا چھوٹا ٹکڑا	معنی
آبِ جا	خیام	آبِ حیات	معنی
خوش نہاد	کرم کار ساز	خوش اخلاق	معنی
توشہ	ناخدا	سفر کے دوران مسافروں کا کھانا	معنی
زاد	شاہوار جند	راستے کا خرچ	معنی

تختِ فرس پر علی اکبر کا خطاب

معنی	الفاظ	معنی	الفاظ
روشن سورج	شرعت	تیزی	معنی
قناتی اللہ کا مقام	ناسوت	عالم اجسام، دنیا، ظاہر	معنی
زمانے کا بادشاہ	یا قوت	سرخ رنگ کا ایک قیمتی پتھر	معنی
گھوڑے کے قدموں سے بننے والا دائرہ	آب	چمک، روشن	معنی

نیسان

بند کشا / عقدہ کشا

آئینہ گر

ہما

بارش

گر چیں گولے والا،
مٹکھیں آسان کرنے والا

آئینہ بنانے والا

ایک خیالی پرندہ، کہا جاتا ہے کہ
جس کے سر کے اوپر سے ہوا گزر
جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے

خاصا خدا

عمران

پنہ

ہاروت و ماروت

اللہ کے خاص بندے

حضرت موسیٰ کے والد کا نام

چمچ

وہ دفرشتے جو بنی اسرائیل کی آزمائش
کے لیے اللہ تعالیٰ نے بابل شہر میں بھیجے
تھے۔

امید

الفاظ

مکاپو

کئی / کے

کلمبس / کولمبس

(columbus)

نظم جہاں

جوتا

موجزن

دنیا کا نظم و ضبط

جو سنے والا، بلی چلانے والا

موجیں مارتا ہوا

الفاظ

ندول بجھا

چنے

کھان

در و پہناں

محرّم

سمیں

معنی

ماپیں نہ کر

واسطے کے لیے

حضرت یعقوب اور حضرت
یوسف کا وطن

چھپا ہوا دروازہ

راز دان

روشنی

معنی

دوڑ دھوپ

ایران کے بادشاہان کا لقب

ایک سیاح جس نے امریکہ دریافت کیا

دنیا کا نظم و ضبط

جو سنے والا، بلی چلانے والا

موجیں مارتا ہوا

نصیحت اخلاقی

الفاظ

ہونہار

غیور

معنی

ہونے والا، جس میں لیاقت اور قابلیت

کے آثار پائے جائیں۔
فیثرت مند

معنی

ظاہر ہونا

صفت

حسن

مدکار

الفاظ

ظہور

پند

مقتیل

معین

جلوہ بحر

الفاظ

شرار

فسوں کر

خیار

سکھ

پرست

رباب

معنی

چنگاریاں، یہاں مراد ستارے

جادوگر

ماجست، آرزو

ناقوس، بتل کی سیگ سے بنتا ہے

محبت

ایک آلودہ موسیقی

معنی

رات کے پیدا کردہ

مشرق

شاہ کی جمع، حاضر

ہت خانہ

پوچھا کرنے والے

بڑی شہر جس میں دوسری شہر آکر ملتی ہیں

الفاظ

زادگان شب

شرق

شہر

مستم کردہ

چاری

جوبار

پراننا کوٹ

الفاظ

باوا آدم

دہان دھم

چینی اکھڑیوں

خراج

ورق

عبرت

معنی

سر دیوں کا موسم

بولی بول کر بیچنے کا فعل

عام دعوت

مصل مندو دست

آزما ہوا، تجربہ کار

ایک پرگلی جہاز راں

زندہ یاد دہنا

الفاظ

جاڑوں

خیلا

ملائے عا

پاراں نکتہ داں

آزمودہ کار

واسکوئی گاما

سے پونا

یہ سرکس

الفاظ

گرداب

پھر کر

رسم دہرہا

زہرہ آب

ہرچہ بادباد

بہرا دیان

چٹا نیاں

معنی

جس کا مقررہ وقت ختم ہو چکا ہو

جن کا کوئی پرسان حال نہ ہو

شکار

بارش کا وقت

کانٹے

الفاظ

زانہا لہجہ

بہرہ دہنا

مید

دم پاران

خار

قطعات

الفاظ

شان بیداری

خلافت

مختب

کشی

معنی

مستعد ہونے کی علامت

مکدگی

اقتاب کرنے والا

میدل کشی

معنی

پناہ دینے والے، مہاجرین

خواتین

سوسپر۔ جھاڑو دینے والا

جھاڑو دینے والا

الفاظ

پناہ گزین

پردہ نشین

بکلی

چاروب کش

اخلاص

الفاظ

شیا

یک جنبش کام

میاد

معنی

ایک بلند ستارہ

ایک قدم کی حرکت

شکاری

معنی

کدھ سے کدھ ملتا ہو برابر

غلطی، مہر، مروت، ہمدردی

داکی، ہمیشہ

الفاظ

ہم دوش

اخلاص

دوام

غزلیات میر تقی میر

معنی	الفاظ	معنی
دل اٹھانا	آواز	غم کشاں
بے خود	مذہب سوزنا، دلچسپی نہ لینا	آب گرم
جبین	غافل	جسم خاک
پریش	پیشانی	آلودہ
پیری	عبادت، پوجا	ڈھوننا
	بڑھاپا	آب حیات
		ہمیشہ کی زندگی دینے والا پانی

خواجہ میر درد

معنی	الفاظ	معنی
صریحاً	واضح، صاف	مذکور
مقدور	طاقت، قدرت	تئیں
ناسور	نہانا اور لا علاج زخم	مقتضب
		ذکر ہونا
		تک
		احتساب کرنے والا، قاضی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

معنی	الفاظ	معنی
ناگہ	کف	اچانک
گل اندام	لب بام	پھول جسم والا، محبوب
گلست رنگ	اسیر	رنگ اڑ جانا
پر خمار	قطع	نشی
		ہتھیلی، جھاگ
		کوٹھے یا چھت کا کنارہ
		قیدی
		ترک ملاقات، کاٹنا، چھوڑنا

مرزا غالب

معنی	الفاظ	معنی
دائم	حرف مکرر	ہمیشہ، مستقل
لعل و زمرد	بھرم کھلنا	جیتی اور خوش نما چتر
قدم بوسی	طرہ پر پیچ و خم	قدم چومنا، انتہائی احترام کا اظہار کرنا
خستگی	تیغ ستم	زخمی ہونا، شکستہ حالی
		غلطی سے دوبارہ لکھا ہوا لفظ
		راز کھلنا، اعتبار اٹھنا
		ختم دار بڑی پگڑی جو امارت کی نشانی سمجھی جاتی ہے
		ظلموں کی تلوار

مرزا داغ دہلوی

معنی	الفاظ	معنی
کونک دم	کم نگاہی	کچھ دیر کے لیے
		کم نظری، کم فہمی

مؤمنین کا تعارف

(۱) ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار (پہلی ایچ ڈی اردو):
۱۹۹۱ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو اور بعد ازاں پہلی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامیہ کالج یونیورسٹی
پشاور کے شعبہ اردو میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور کی اردو لازمی برائے جماعت خیم
اور دوم کے مؤلف بھی رہے ہیں۔

(۲) پروفیسر خالد صفیر ڈار:
۱۹۷۷ء میں جامعہ پشاور سے ایم۔ اے اردو درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۷۷ء سے محکمہ ہائیر ایجوکیشن کے تحت صوبے
کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور میں بھی اپنی خدمات بطور مؤلف انجام
دیتے رہے۔ آپ اردو اختیاری گیارہویں اور بارہویں جماعت کی کتاب کے بھی مؤلف ہیں۔ آج کل گورنمنٹ
سیریس سائنس کالج پشاور میں ایسوی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۳) پروفیسر محمد جمال:
۱۹۸۹ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء سے ایڈورڈز کالج پشاور میں درس
و تدریس سے منسلک ہیں۔ ۲۰۰۰ء سے صدر شعبہ اردو (ایڈورڈز کالج) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۴) ڈاکٹر جاوید بادشاہ (پہلی ایچ ڈی اردو):
پشاور یونیورسٹی سے ۱۹۷۸ء میں ایم۔ اے اردو کیا اور اسی سال اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور میں درس و تدریس سے منسلک
ہو گئے۔ پاکستان میں اور بیرون ملک اردو کے حوالے سے منعقد ہونے والی کئی کانفرنسوں میں شریک ہو چکے ہیں۔

(۵) ڈاکٹر طارق ہاشمی (پہلی ایچ ڈی اردو):
آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے اور پشاور یونیورسٹی سے پہلی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ایڈورڈز
کالج پشاور میں درس و تدریس سے منسلک رہے۔ آج کل فیصل آباد یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ
پشاور کی اردو اختیاری جماعت گیارہویں اور بارہویں کتاب کے مؤلف بھی ہیں۔

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
پس اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادیا کرو

اور اللہ سے ڈرتے رہو

تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(سورۃ الحجرات: ۱۰)

جو حرام کھاتا ہے اس کی دُعائیں

قبول نہیں ہوتیں۔

(حدیث نبوی ﷺ)